افسانے
سالک لکھنوی
ترتیب و مقدمہ
ڈاکٹر عمر غزالی

افسانے

سالک لکھنوی

ترتیب ومقدمہ

ڈاکٹر عمر غزالی

صدر شعبۂ اردو، دارجلنگ گورنمنٹ کالج، دارجلنگ

کتاب کا نام : افسانے

مصنف : سالک لکھنوی

ترتیب و مقدمہ : ڈاکٹر عمر غزالی

طبع اول : 2008ء

صفحات : 144

کمپوزنگ، سرورق : علی ظفر (**میرا گرافکس**)

41، مدن موہن برمن اسٹریٹ، کولکاتا۔ 7

طباعت : گرافک پرنٹ، ۳۹/۲/ار اسماعیل اسٹریٹ، کولکاتا۔۱۴

قیمت : -/150 روپے

ناشر : ڈاکٹر عمر غزالی (145/B رچترنجن ایونیو، کولکاتا۔ 7)

تقسیم کار

(۱) موڈرن پبلیشنگ ہاؤس

9 گولا مارکیٹ، دریا گنج، نئی دہلی۔110002

(۲) انجمن ترقی اردو ہند، اردو گھر

212 راؤز ایونیو، نئی دہلی۔110002

(۳) بک امپوریم، سبزی باغ، پٹنہ۔۸۰۰۰۰۴

(۴) دانش محل، امین الدولہ پارک، لکھنؤ

AFSANAY (Salik Lucknavi)

Edited By

Dr. Omar Ghazali

Head, Department of Urdu, Darjeeling Govt. College

Edition 2008

Price : Rs. 150/-

انتساب

استاد محترم

ڈاکٹر اسلم پرویز

کے نام

جن کی محبتیں

میرے لئے

متاع بے بہا ہیں

رہِ شوق میں یہی حال تھا، رہِ شوق میں یہی حال ہے

پسِ کارواں کبھی رہ گئے، کبھی منزلوں سے نکل گئے

(سالک لکھنوی)

فہرس

نام مصنف : سالک لکھنوی (شوکت ریاض کپور)

والد کا نام : تلسی رام کپور (اسلام قبول کرنے سے پہلے)
طارق ریاض کپور عرف محمد احمد
(۱۹۰۹ء میں اسلام قبول کرنے کے بعد)

پیدائش : ۱۶؍دسمبر ۱۹۱۳ء لکھنؤ (اتر پردیش)

تعلیم : بی۔اے، سینٹ زیورس کالج، کلکتہ، بی۔کام۔ سٹی کالج کلکتہ،
دبیر کامل (فارسی) لکھنؤ یونیورسٹی، لکھنؤ۔

اسیری : بسلسلۂ تحریک ''ہندستان چھوڑو'' ۱۹۴۲ء - ۱۹۴۳ء

شغل : افسانہ نگاری، تنقید نگاری، شاعری، شرح نگاری، ترجمہ، صحافت، سیاست، سماجی خدمت

تصانیف : عذرا اور دیگر افسانے (افسانوں کا مجموعہ) ۱۹۴۱ء
پسِ شعر (تشریح اشعار بطرز نو) ۱۹۸۱ء
بے سروپا (طنزیہ و مزاحیہ مضامین کا مجموعہ) ۱۹۸۲ء
بنگال میں اردو نثر کی تاریخ - آغاز تا حال ۱۹۹۸ء
کلام ۱۹۹۹ء
مضامین ۲۰۰۶ء

تراجم : کامریڈ مظفر احمد، حیات و خدمات ۱۹۸۳ء
ترجمے ۲۰۰۸ء

مناصب : سابق نائب صدر یتیم خانہ اسلامیہ کلکتہ
سابق سکریٹری اور صدر سی ایم او ہائی اسکول، کلکتہ
سابق سکریٹری اور نائب صدر انجمن ترقی اردو (ہند) کلکتہ
آلڈرمین، کلکتہ کارپوریشن ۱۹۸۵ء - ۱۹۹۰
چیئرمین مغربی بنگال اردو اکاڈمی، کلکتہ ۱۹۹۱ء - ۲۰۰۱ء
ایڈیٹر روزنامہ ''آبشار'' کلکتہ ۱۹۸۸ء تا حال
جوائنٹ ایڈیٹر ہفتہ وار ''آثار'' کلکتہ ۱۹۵۹ء - ۱۹۶۱ء

اعزازات : ''جنگ آزادی'' اوارڈ ۱۹۵۷ء
ملیح آبادی اوارڈ، مغربی بنگال اردو اکاڈمی ۱۹۸۳ء
کل ہند پرویز شاہدی اوارڈ مغربی بنگال اردو اکاڈمی ۱۹۹۹ء

پیش لفظ

سالکؔ لکھنوی اس وقت اردو دنیا کی سب سے بزرگ، نہایت فعال اور روشن خیال شخصیت کا نام ہے۔صرف بنگال ہی نہیں' ساری اردو دنیا میں وہ ایک متحرک صاحب ضمیر اور باکمال قلمکار کی حیثیت سے جانے جاتے ہیں۔ان کی عمر نوے سال سے زیادہ ہے اور کم وبیش ستر سال سے ادب وشعر اور صحافت کی دنیا میں وہ ایک پہچان رکھتے ہیں۔ان کا احترام ترقی پسند ادبی تحریک کے معمار کی حیثیت سے کیا جاتا ہے۔وہ شاید اردو کے ان ادیبوں میں آخری ہیں جنہوں نے 1936 کی ترقی پسند مصنفین کی پہلی کانفرنس میں شرکت کی تھی اور پھر کلکتہ اور دوسرے شہروں کی بڑی کانفرنسوں میں سرگرمی سے حصہ لیا۔

ہم انہیں ایک ممتاز شاعر، افسانہ نگار اور مزاحیہ نگار، محقق، صحافی اور شرح نگار کی حیثیت سے جانتے ہیں۔طویل عرصہ سے وہ کمیونسٹ پارٹی کے اخبار ''آبشار'' کی ادارت کے فرائض انجام دے رہے ہیں۔دوسری جانب جنگ آزادی کے ایک سپاہی اور بائیں بازو کی سیاسی قیادت کے ایک سرگرم اور ممتاز رکن کی حیثیت سے بھی ان کی عملی جدوجہد اور قربانیوں کی داستان کم دلچسپ نہیں ہے۔

نوجوان اسکالر ڈاکٹر عمر غزالی' سالکؔ صاحب کی علمی اور ادبی شخصیت سے خاص عقیدت رکھتے ہیں۔میں نے ان سے فرمائش کی تھی کہ وہ سالکؔ صاحب کی ایک سوانح حیات مرتب کریں۔اس مقصد کے تحت وہ ان کی حیات اور ادبی خدمات کے حوالے سے مواد جمع کرتے رہے ہیں۔اس تگ ودو میں انہیں سالکؔ صاحب کے وہ افسانے ملے جو انہوں نے جوان عمری میں 1931 سے 1941 تک کے زمانہ میں لکھے تھے۔میں فکشن کا طالب علم رہا ہوں۔دل میں خواہش ہوتی کہ چوتھی دہائی یعنی پریم چند کی زندگی میں سالکؔ

صاحب کی کہانیوں کا کیا اسلوب تھا۔ ڈاکٹر عمر غزالی نے چند کہانیاں مجھے پڑھنے کو دیں تو اندازہ ہوا کہ کہانیوں کی زبان اور طرز بیان میں غیر معمولی پختگی، روانی اور سادگی ہے۔ حالانکہ بیشتر کہانیاں ایسی ہیں جو دوسری زبانوں کی شاہکار کہانیوں سے ماخوذ ہیں۔ یہ وہ زمانہ تھا جب عالمگیر، خیام اور ہمایوں جیسے مقبول ادبی رسائل میں طبع زاد کہانیوں کے ساتھ مغربی افسانوں کے ترجمے یا اخذ کیے ہوئے قصے تھے۔ ماحول اور کرداروں کے نام بدل کر شائع ہوئے تھے۔ سالکؔ صاحب نے بھی سمرسٹ ماہم، لیوٹالسٹائی اور موپاساں جیسے صف اول کے افسانہ نگاروں کی بہترین کہانیوں کا انتخاب کیا اور انہیں اپنی تخلیقی بصیرت سے ایسا روپ دیا کہ وہ بالکل طبع زاد کہانیوں کے طرز پر پڑھی گئیں۔ موپاساں کے ایک افسانے کا ترجمہ جوش ملیح آبادی کے رسالہ ''کلیم'' میں بھی شائع ہوا۔

ابتدامیں ان کی ایک کہانی ''اچھوت'' رسالہ آئینہ میں 1934 میں شائع ہوئی جس میں اسی زمانہ میں لکھی ہوئی پریم چند کی کہانیوں ''نجات'' اور ''گھاس والی'' کا اثر نظر آتا ہے۔ یہ ایک غربت زدہ دلت کنبہ کی بدحالی کی کہانی ہے۔ لیکن آخر میں پریم چند کے آدرش واد کی طرح سالکؔ صاحب نے بھی اصلاحی جذبہ کے تحت دلت لڑکی کی قسمت بدلتی دکھائی ہے۔ یعنی اونچی برادری کا ایک نوجوان دلت لڑکی کو اپنا لیتا ہے۔ اس مختصر سی طبع زاد کہانی میں حقیقت پسندی کا گہرا رنگ نمایاں ہے۔ اگر چہ دوسری کہانیاں جن کا پلاٹ یا مرکزی خیال مغربی افسانوں سے ماخوذ ہے' اپنے موضوع کے اعتبار سے رومانوی فضا کی حامل ہیں۔ سالک صاحب نے ان کے قصے کو بے حد دلچسپ' رنگین اور ڈرامائی انداز میں پیش کیا ہے۔ مثلاً ''فارانی'' میں خود فارانی کا کردار انجام تک بے حد پراسرار بنا رہتا ہے۔ اصل میں یہ عذرا اور ریاض کے عشق بلاخیز کی داستان ہے۔ ''صندوق'' بھی ایک مشہور کہانی کا اردو ورژن ہے جسے سالکؔ صاحب نے نہایت ہنرمندی سے پیش کیا ہے۔

''قمار باز'' ایک شاطر جواری کی کہانی ہے لیکن اس میں انسانی نفسیات کے کئی

نازک پہلوؤں سے کام لیا گیا ہے۔ اس کا ماحول مغربی معاشرہ سے تعلق رکھتا ہے۔ اس سے زیادہ دلچسپ کہانی ''سزا'' ہے۔ اس کا ماحول بھی مغربی ہے۔ ایک حسینہ کا عاشق اپنے رقیب کو Duel کے لئے چیلنج کرتا ہے۔ لیکن رقیب اس بے معنی خون ریزی کے لئے آمادہ نہیں ہوتا۔ حریف عاشق حسینہ اور پورا سماج بزدل کا طعنہ دے کر اسے ملامت کرتا ہے۔ لیکن آخر میں یہی بزدل اس حسینہ اور اس کے شوہر کی جان بچانے میں خود اپنی جان قربان کر دیتا ہے۔ مجموعہ میں شامل ایک شاہکار کہانی ''وہ بائیس دن'' ہے جو 1940 میں خیام، لاہور میں شائع میں ہوئی تھی۔ اس کا ماحول اور مقامات ہندوستانی ہیں۔ اس لئے اس کے بیانیہ میں طبع زاد کہانی کا رنگ پیدا ہو گیا ہے۔ آسام، شیلانگ اور چراپونجی کے فطری مناظر کی مصوری نہایت محاکاتی ڈھنگ سے کی گئی ہے۔ کہانی کی تکنیک ڈائری کی صورت میں ہے۔ حسن و عشق کی داستان ہونے کے باوجود اس میں حقیقت کا گہرا رنگ ہے اور اس کا تاثر بھی دیرپا ہے۔ اس میں سالک صاحب کے دلکش طرز بیان کا بڑا دخل ہے۔ اب سے تقریباً ستر سال قبل لکھی ہوئی ان کہانیوں میں غضب کی تازگی ہے۔ بہالے جانے والی روانی ہے۔ ان کہانیوں کے مطالعہ سے آزادی سے قبل کے افسانوی ادب کے رجحانات اور تخلیقی رویوں کا احساس ہوتا ہے۔ اس سے اہم بات یہ ہے کہ ان کہانیوں کے آئینہ میں ہمارے ایک بزرگ اور ممتاز تخلیق کار کی تصنیفی زندگی کے پہلے دور کی نقاب کشائی ہوتی ہے۔

پروفیسر (ڈاکٹر) قمر رئیس

☆☆☆

عرض مصنف

اردو زبان میں ایک مشہور کہاوت ہے کہ ''جوانی دیوانی'' ہوتی ہے۔ اس کہاوت میں اگر ''جنونِ علم وتحقیق'' کو بھی شامل کرلیا جائے تو جوانی دیوانی کی جو تصویر ابھر کر سامنے آئے گی اس میں عزیزی ڈاکٹر عمر غزالی بھرپور نظر آئیں گے۔

اب دن تاریخ تو یاد نہیں۔ شام کا وقت تھا۔ میری پوتی نے کہا۔ ''پاپا' آزاد کالج سے ایک پروفیسر صاحب آئے ہیں، آپ سے ملنا چاہتے ہیں!''

''ضرور تشریف لائیں، میرا دروازہ تو کسی کے لئے کبھی بند نہیں ہوا'' میں نے کہا۔

کمرے میں جو صاحب داخل ہوئے وہ کہیں سے ''پروفیسر'' نظر نہیں آئے۔ کسی کالج کے اسمارٹ متعلم ضرور تھے۔ کھلتا ہوا رنگ، لانبا قد، بکھرے ہوئے بال کاندھوں تک آئے ہوئے۔ آنکھوں میں چمک اور ہونٹوں پر مسکراہٹ۔ مجھے دیکھتے ہی بولے۔ ''پاپا نے سلام پیش کیا ہے' میں حضرت بازغ بہاری کا چھوٹا بیٹا ہوں!''

بازغ بہاری آج مغربی بنگال میں اعلیٰ معیاری ظرافت کے تنہا بڑے شاعر، میرے کرم فرما اور مخلص دوست ہیں۔ ان کے صاحبزادے کو میرے یہاں کسی تعارف کی کیا ضرورت ہو سکتی ہے۔ سر آنکھوں پر آئیں!

انہوں نے بیگ کاندھے سے اتارتے اور ایک کرسی پر بیٹھتے ہوئے کہا:

''میں آپ کے طبع زاد اور ترجمہ شدہ افسانوں پر تفتیشی کام کر رہا ہوں۔ آپ کی مدد کی ضرورت ہے!''

''میرے خیال میں آپ اپنی صلاحیت کو غلط راہ پر لے جا رہے ہیں، ستر (70)، پچھتر (75) سال قبل تک جس افسانوی ادب کی جانب میں گامزن تھا' وہ سفر 51-1950ء میں ختم ہوگیا۔ اس دوران میں بہت سی ادبی قدریں تہہ و بالا ہوگئیں۔ میں نے بہت سے افسانے لکھے۔ میں خود اپنے بہت سے افسانوں کے نام بھول چکا ہوں۔ کچھ رسالوں کے نام ضرور یاد ہیں لیکن ان کے سنینِ اشاعت یاد نہیں۔ آپ نے دس بیس افسانے اگر ڈھونڈ بھی نکالے اور انہیں کتابی صورت بھی دے دی تو صرف اپنا سرمایہ اور وقت برباد کرنے کے کچھ بھی حاصل نہیں ہوگا۔ آپ نے ایک عمدہ موضوع پر ڈاکٹریٹ کیا ہے۔ آپ مستقبل کی طرف دیکھئے۔ ستر، پچھتر سال پرانے غاروں میں کیوں جھانکنے جا رہے ہیں۔ ایک بڑی تلخ حقیقت چیخ چیخ کر کہہ رہی ہے کہ'' آج اردو کا قاری اردو کی ادبی کتاب خرید کر نہیں پڑھتا!'' میں آپ کی ہمت شکنی نہیں کر رہا ہوں، سچ بول رہا ہوں!

وہ صبر و خاموشی سے میری بات سنتے رہے۔ شاید سوچ رہے ہوں عمر رسیدہ بیکار قسم کے اشخاص اسی قسم کی نصیحتیں کرتے اور اپنی فضیحتیں کرتے رہتے ہیں۔ بڑی شائستگی سے بولے:

''میں تقریباً سارا کام کر چکا ہوں۔ چونکہ افسانوں کے مصنف آپ ہیں اس لئے اپنی طرف سے کچھ لکھ دیں!''

اب اپنے افسانوں پر اپنی رائے کیا دوں؟ ہاں' اردو کے افسانوی ادب میں سب سے اہم کام حضرت قمر رئیس مدظلہٗ نے کیا ہے۔ پریم چند کے ناولوں اور افسانوں پر ان کی رائے حرف آخر کا درجہ رکھتی ہے۔ میرے افسانوں کو انہوں نے قابل اعتنا سمجھا' یہ میرے لئے باعث فخر ہے۔ میں ان کا احسان مند ہوں۔

سالک لکھنوی

مقدمہ

سالک لکھنوی کی شخصیت محتاج تعارف نہیں۔ ان کی ہشت پہلو شخصیت سے قطع نظر جب ہم ان کی افسانہ نگاری کا جائزہ لیتے ہیں تو یہ ادارک ہوتا ہے کہ یہ افسانے نہ صرف زندگی آموز ہیں بلکہ زندگی آمیز بھی ہیں۔ ہر چند کہ یہ افسانے حجم کے لحاظ سے کچھ زیادہ نہیں لیکن ان کی کیفیت اور کمیت اپنی جگہ مسلّم ہے۔ یہی کیفیت اہل قلم کے لئے سرمایۂ افتخار ثابت ہوتی ہے اور باعث شہرت دوام بھی بنتی ہے۔ سالک کے یہ ''افسانے'' پریم چند (عمر کی آخری دہائی)، کرشن چندر، بیدی، منٹو وغیرہ کے زمانے کے لکھے ہوئے ہیں جن سے متعلق لوگوں کی واقفیت غالباً نہیں ہے۔ بقول شخصے یہ ''افسانے'' بہت پرانے ہیں اور اردو ادب پر کوئی خاص اثر مرتب نہیں کرتے۔ نہ صرف یہ بلکہ اردو ادب میں کوئی اضافہ بھی نہیں

کرتے۔اس ضمن میں میں اتنا ہی کہوں گا کہ سالکؔ نے 1933ء سے افسانے لکھنا شروع کیے جن کا سلسلہ 1942ء تک قائم رہا۔یعنی سالکؔ کے افسانوی ادب کی کل میعاد محض دس برس ہے۔ان دس برسوں میں انہوں نے جو افسانے لکھے ان کی اپنی ایک الگ انفرادیت اور اہمیت ہے۔کیونکہ اس زمانے میں سوائے پریم چند کے کسی کو مستند نہیں مانا گیا، باوجود اسکے کئی کہانیاں پریم چند کے نام سے منسوب کردی گئیں اور ان پر بھی Adoptation کا الزام لگا۔لیکن پریم چند کی شخصیت پر کوئی اثر نہیں پڑا۔کرشن چندر، بیدی اور منٹو اس زمانے میں عام افسانہ نگار تھے اور انہیں درجۂ استناد حاصل نہیں ہوا تھا۔وہ مسلسل افسانے لکھتے رہے جبکہ سالک نے لکھنا بند کردیا۔اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا پریم چند کے بعد افسانوی میدان میں قدم رکھنے والے وہ افسانہ نگار جنہوں نے کم تعداد میں افسانے لکھے‘ ان کی کوئی اہمیت نہیں۔میں مانتا ہوں کہ سالکؔ نے ابتدائی افسانوی ادب میں غالباً کوئی اضافہ نہیں کیا ہو لیکن انہوں نے اس زمانے کے طرز پر جو افسانے تخلیق کیے‘ کیا ان میں ادبیت نہیں ہے؟ یا ان میں افسانے کے عناصر ترکیبی کی پاسداری نہیں کی گئی ہے؟ تو پھر کیا وجہ ہے کہ ان افسانہ نگاروں میں سالکؔ کی شمولیت نہیں ہوسکتی؟

سالکؔ بہ یک وقت شاعر، محقق، نقاد، طنز و مزاح نگار، خاکہ نگار، مترجم، شارح، صحافی اور افسانہ نگار ہی نہیں بلکہ ایک مجاہد آزادیٔ ہند بھی ہیں۔عملی سیاست سے ان کی وابستگی ہمیشہ رہی اور آج بھی اس عمر میں باقی ہے۔وہ کلکتہ میں 1937ء سے 1949ء تک کانگریس پارٹی کے اہم رکن اور عہدہ دار ہوئے۔1942ء کی ’’ہندستان چھوڑو تحریک‘‘ میں پیش پیش رہے، جس کی پاداش میں دو سال کی قید ہوئی۔ان کی جیل کی زندگی کے دوران ہی ’’قحط بنگال‘‘ رونما ہوا جس میں سالکؔ نے اپنے قیدی ساتھیوں کے ساتھ مل کر یہ فیصلہ کیا کہ وہ اپنے وقت کا کھانا نہ کھا کر قحط زدہ لوگوں کی کچھ مدد کرسکتے ہیں۔اس طرح کل 150 قیدی اپنے ایک وقت کا کھانا ہر شام ’’رام کرشن مشن‘‘ کے حوالے کردیا

کرتے۔ بارہ، تیرہ مہینے بعد رہائی ہوگئی کیونکہ گاندھی جی اور انگریزوں کے درمیان معاہدہ ہوگیا تھا اور ہزاروں کی تعداد میں قیدی چھوڑ دیئے گئے۔ وہ 1950ء سے 1964ء تک کمیونسٹ پارٹی آف انڈیا سے منسلک رہے۔ جب 1964ء میں یہ پارٹی دوحصوں میں تقسیم ہوگئی تو 1964ء سے آج تک کمیونسٹ پارٹی آف انڈیا (مارکسی) [CPI(M)] میں شمولیت اختیار کئے ہوئے ہیں۔ اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ سالک کی پوری زندگی عملی سیاست سے جڑی رہی ہے۔ وہ ایک سماجی کارکن کی حیثیت سے بھی اپنی خدمات انجام دیتے رہے ہیں۔ شہر کلکتہ کے ''آلڈرمین'' بھی رہ چکے ہیں۔ ان باتوں کو بیان کرنے کا مقصد صرف یہ ہے کہ افسانہ نگار سالک کی زندگی کے نشیب و فراز ہمارے پیش نگاہ ہوں اور ان کے ذہنی مدوجزر کا احاطہ کیا جاسکے تاکہ ان کے افسانوں کی تفہیم میں کسی طرح کی دشواری حائل نہ ہو اور ان کے مافی الضمیر تک آسانی سے پہنچا جاسکے۔

سالک جس زمانے میں افسانے کی طرف مائل ہوئے وہ زمانہ ترقی پسندی سے قبل کا تھا۔ ہندستان کئی طرح کی زنجیروں میں جکڑا ہوا تھا۔ ہندستانی عوام انگریزی حکومت کے استبداد کی چکی میں پس رہے تھے۔ غریب، مزدور اور کسان زمینداروں اور سرمایہ داروں کے مظالم اور عتاب کے شکار تھے۔ لوگ ابھی بھی فرسودہ رسم و رواج اور توہمات کی پابندیوں میں جکڑے ہوئے تھے۔ انسان اونچ نیچ، بھید بھاؤ اور ذات پات کے بندھنوں میں بندھے ہوئے زندگی بسر کررہے تھے۔ ان ساری ناہمواریوں اور بے اعتدالیوں کے درمیان سالک اپنی عمر کی اس منزل سے گزر رہے تھے جب وہ کوئی انیس یا بیس برس کی رہے ہوں گے۔ یہی وہ زمانہ تھا جب شاعری اور افسانے کی طرف متوجہ ہوئے۔

سالک کا پہلا افسانہ بعنوان ''اچھوت'' اسحاق امرتسری کے رسالے ''آئینہ'' میں 1934ء کو شائع ہوا۔ یہ افسانہ بہت ہی مختصر افسانہ ہے مگر اس میں افسانے کی وہ ہر بڑائی جھلکتی ہے جو ایک اچھے افسانے میں ہونی چاہئے۔ سماج اور معاشرے میں پنپنے والی

ناہمواریاں مثلاً ذات پات، بھید بھاؤ، اونچ نیچ اور رسم ورواج کی فرسودہ جکڑبندیاں جیسی تمام چیزوں کا احاطہ اس افسانے میں بڑی ہی خوبی کے ساتھ کیا گیا ہے۔

یہ افسانہ ترقی پسند ادبی تحریک سے پہلے کا ہے۔ اس لئے اس میں وہ اثرا مرتب نہیں ہوئے جو ترقی پسند ادبی تحریک کا خاصہ رہے ہیں۔ لیکن اس تحریک نے جن عوامل کو ادب کے پیرائے میں سمونے کی کوشش کی ہے وہ حقیقت پسندی متذکرہ افسانے میں بدرجۂ اتم موجود ہے۔ پریم چند زندہ تھے اور اس زمانے کے مستند افسانہ نگار تسلیم کئے جا چکے تھے جن کے یہاں سماج اور معاشرے کی بے راہ رویوں اور برہنہ حقیقتوں کو چن چن کر اُجاگر کرنے کی کوشش کی گئی تاکہ ان کی بیخ کنی کی سبیل نکل سکے۔ سالک، پریم چند سے متاثر رہے ہیں لیکن ان کی انفرادیت یہ ہے کہ وہ اپنے افسانوی ادب کا آغاز نوجوانی میں ایسے موضوع سے کرتے ہیں جس پر کم افسانہ نگاروں کی نگاہ پڑتی ہے۔ وہ بھی ایسا افسانہ جو محض ڈیڑھ دو صفحات پر محیط ہو، عجیب معلوم ہوتا ہے لیکن سچ کہا جائے تو افسانہ نگار نے ''دریا کو کوزے میں سمونا'' کو عملی طور پر کردکھایا ہے۔ اور حقیقت یہ ہے کہ یہی اجمال واختصار افسانے کا جزو لازم ہے جس کی بنا پر یہ ناول سے متغائر نظر آتا ہے۔ ہاں، مختصر افسانہ رقم کرتے وقت اتنا ضرور ملحوظ رہے کہ اس میں افسانے کے عناصر ترکیبی کا خیال رکھا گیا ہو اور جملے آپس میں زنجیر کی کڑیوں کی طرح مربوط ہوں۔ جملوں کے درمیان باہمی ارتباط اور ہم آہنگی اتنی ہو کہ کہیں سے کوئی ٹکڑا اگر حذف کر دیا جائے تو افسانے کی پوری عمارت منہدم ہو جائے۔ ورنہ ایسے افسانے بھی زینت قرطاس بنے ہیں جن کے جملے تو الگ، پیراگراف کے پیراگراف الگ کر دیئے جائیں تو بھی افسانے کی صحت پر کچھ فرق نہیں پڑتا۔ لیکن سالک کے پیش نظر افسانے سے گزرتے ہوئے یہ احساس ہوتا ہے کہ یہ تمام خامیوں سے پاک ہے اور اتنا ہی Compact بھی کہ اگر ایک لفظ بھی ہٹا دیا جائے تو افسانے کی بنیاد متزلزل ہو جائے۔

افسانہ نگار نے سماج کے سب سے پچھڑے طبقے کو اپنے افسانے کا موضوع بنا کر اسے جلا بخشنے کی کوشش کی ہے۔ نہ صرف یہ بلکہ اپنے افسانے کا کردار بھی چمار میں ہی تلاش کیا ہے۔ چمار، اس کی بیوی اور اس کی چھوٹی سی لڑکی کا تعارف افسانہ نگار نے کچھ اس طرح پیش کیا ہے:

''چمار نیک چلن، ملنسار اور میٹھی زبان رکھتا تھا۔
اس کی بیوی چمارن...... بڑی ہنس مکھ اور رحمدل تھی۔ گھر کے کام دھندوں کے بعد وہ بھی اپنے سوامی کے جوتے ٹانکا کرتی...... دونوں کی آنکھوں کا تارہ، دونوں کی آشاؤں کی دنیا، ایک چھوٹی سی لڑکی تھی جو صحن میں کھیلا کرتی۔'' (اچھوت)

یہاں افسانہ نگار کا اسلوب اس طرح سے ابھر کر سامنے آتا کہ اختصار میں ہی پوری کہانی کا مقصد و منہاج واضح ہو جاتا ہے۔ مکالماتی انداز نے افسانے کو مزید پر تاثیر اور جامع بنا دیا ہے۔ جس طرح غالب نے مراسلے کو مکالمہ بنا دیا، اسی طرح سالک نے افسانوی پیرہن پر مکالماتی گل بوٹے سجا دیئے جو مختصر ہوتے ہوئے بھی پر اثر ہے۔ اسلوب نے اس کے حسن کو اور دوبالا کر دیا ہے۔ اس افسانے میں سماج کی بے راہ روی اور انسانی کس مپرسی کا ذکر بھی ہے اور اس سے ابھر کر سامنے آنے والے مسائل کا تذکرہ بھی۔ مثال کے طور پر ماحول، سماج اور انسانی اضطراری و بے بسی کا ذکر سالک نے کس اختصار کے ساتھ کیا ہے:

''کتنے ہی گاؤں اجڑ گئے تھے...... چاروں طرف وبا پھیلی ہوئی تھی۔ چمارن نے اپنی ساری دولت اپنے سوامی پر نثار کر دی...... مگر موت کا دیو راضی نہ ہوا...... چمارن بیوہ ہو گئی۔ سات برس بیت گئے...... اب لڑکی بارہ برس کی تھی۔ گاؤں کی آبادی بڑھ گئی۔ موت کے دیوتا کو غصہ آ گیا۔ چتائیں روشن ہو گئیں اور گورستان آباد...... چمارن کو بھی دورہ پڑا اور وہ بیمار ہو گئی۔'' (ایضاً)

چمارن کی حالت جب زیادہ نازک ہوتی ہے تو اس کی لڑکی دوڑی گاؤں

کے وید کے پاس جاتی ہے، بہت ہی منت سماجت کرتی ہے مگر پنڈت جی کے کان پر جوں تک نہیں رینگتی۔ وہ اس لئے کہ پنڈت جی اچھوت کے گھر کیسے جائیں؟ ان کا دھرم نشٹ ہو جائے گا۔ ناامید ہو کر جب چمارن کی لڑکی گھر واپس آتی ہے تو ماں کی حالت ابتر پاتی ہے۔ اس کی ماں پیاس کی شدت سے تڑپتی رہتی ہے۔ اتفاق سے گھر میں پانی نہیں ہوتا ہے تو وہ لڑکی پانی لانے کنواں پر جاتی ہے جہاں برہمن مہاشے کھڑے غسل فرما رہے ہوتے ہیں۔ لڑکی ماں کی حالت بتاتی ہے اور تھوڑا پانی مانگتی ہے تو مہاشے کی آنکھیں سرخ ہو جاتی ہیں کیوں کہ وہ ایک اچھوت لڑکی کو اپنے ہاتھوں سے پانی کیوں کر دیتے؟ ڈانٹ پلائی اور بے حیا و بے شرم کہہ کر دور ہو جانے کے لئے کہا۔ اس طرح سماجی بندھنوں اور ذات پات کی جکڑ بندیوں میں اس کی ماں ہمیشہ کے لئے آنکھیں موند لیتی ہے۔

کہانی کے اس پڑاؤ پر لڑکی تن تنہا روتی بلکتی رہ جاتی ہے۔ کوئی اس کے زخموں پر ہمدردی کا پھاہا بھی نہیں رکھتا۔ افسانہ نگار یہاں سماجی ناہمواریوں کے ساتھ ساتھ اس ماحول کی عکاسی کرنے سے بھی نہیں چوکتا ہے جہاں اس اچھوت لڑکی کی پزیرائی خود برہمن مہاشے کرتے ہیں اور اپنے ہاتھوں سے اسے پانی بھی پلاتے ہیں۔

اس درمیان افسانہ نگار نے رومانی سین بھی ڈال دیا ہے۔ وہ یہ کہ چمارن کی لڑکی جب ''وید مہراج'' کے بیٹا پیدا ہونے کی خوشی میں دعوت کے موقع پر ناچتی اور گاتی ہے تو ایک نوجوان اس کی جانب مائل ہو جاتا ہے اور اس سے عشق کرنے لگتا ہے۔ لیکن لڑکی اپنی اصلیت سے غافل نہیں ہوتی، وہ کہتی ہے کہ:

> ''میں تمہاری نہیں ہو سکتی...... میں اچھوت ہوں، ایک فاحشہ چمارن، تم شریف ہو، شریف لڑکے ہو...... میں نیچ ہوں، تم اونچ ہو...... میں تمہاری نہیں ہو سکتی، تم برادری میں ذلیل ہو جاؤ گے...... بدنام ہو جاؤ گے۔!'' (اچھوت)

تب اس کا عاشق کہہ اٹھتا ہے:

''آکاش کے نیچے سب برابر ہیں۔کوئی چھوٹا بڑا نہیں۔ میں تمہارا ہوں، تم میری ہو جاؤ!'' (ایضاً)

یہاں افسانہ نگار نے عشق کے وسیلے سے سماج کی تمام بندشوں، اونچ نیچ' بھید بھاؤ، اعلیٰ وادنی اور ذات پات کے خلیج کو پاٹنے کی کوشش کی ہے اور محبت ورواداری کا بیج بویا ہے جہاں اچھوت نام کی کوئی چیز نہیں، جہاں تمام انسان برابر ہیں۔

سالک لکھنوی کا ایک طویل افسانہ ''فارانی'' ہے، اس کے توسط سے محبت کی اس تثلیث کو پیش کیا ہے جہاں ''انارکلی'' کا مثلث بھی کم کم نظر آتا ہے۔ بقول افسانہ نگار ''میرے نظریہ میں ''محبت'' دلی کمزوری کا دوسرا نام ہے!'' جب دلی کمزوری کا دوسرا نام ''محبت'' ہی ٹھہری' تو ظاہر ہے کہ اس میں انسان کتنا بے بس اور مجبور ہوسکتا ہے، جسے افسانہ نگار نے انسانی زندگی کی عجیب ترین شئے کہا ہے۔کہانی کی ابتدا براہ راست شادی سے ہوتی ہے۔لیکن یہ شادی عذرا کے ضمیر کی آواز کے موافق نہیں تھی۔ کیوں کہ اس رشتے سے قبل بھی ایک رشتہ ریاض سے پروان چڑھ رہا تھا جو خوابوں کی تعبیر بننے سے قبل ہی دم توڑ چکا تھا لیکن روح کی گہرائیوں میں اسی کا نام تھا۔وہی اس کے دل کی دھڑکنوں کا محرک تھا۔اصل میں ریاض ہی ماضی قریب کا وہ اصل عاشق تھا جو بچپن سے لے کر جوانی کی بھیانک وادیوں میں ایک ساتھ قدم سے قدم ملا کر چلا تھا، جس کی محبت کا مفہوم ''بس محبت کیے جاؤ پاک اور بے لوث محبت!'' کے فلسفے پر مبنی ہے۔اس بے لوث محبت کو افسانہ نگار نے اس مرض سے تشبیہ دی ہے جو لاعلاج ہے۔

افسانہ نگار نے یہاں اس حقیقت کو بھی بے نقاب کیا ہے کہ ہمارے سماج میں ایک عورت کی بہت ساری مجبوریاں ہوتی ہیں جن میں عورت ہونا خود ایک بڑی مجبوری ہے۔وہ چاہ کر بھی اپنی چاہت کا اظہار نہیں کرسکتی۔اس لئے کسی کی چاہت اس کے دل کے نہاں خانے میں کسمساتی رہتی ہے۔عورت کا دل کسی کو چاہ تو سکتا ہے مگر ضروری نہیں کہ اس

کی تمنائیں اسی چاہت سے پوری ہوں بلکہ زمانۂ گذشتہ کی رنگین مگر دھندلی تصویروں کی طرف سے آنکھیں بند کر کے فارانی کو قبول کر کے وہ جب اس کی گرم بانہوں میں سانس لینے لگتی ہے تو عذرا کی تمنائیں مچلنے لگتی ہیں۔اس کے رنگین خواب کی تعبیر مل رہی ہوتی ہے جو اصل میں خواب سے بھی زیادہ رنگین معلوم ہوتی ہے۔ جہاں وہ ماضی قریب (ریاض) اور مستقبل سے جذبات کی اسی کش مکش میں کچھ وقت کے لئے منہ موڑ لیتی ہے اور حال میں جی بھر کر جی لیتی ہے۔حال تو وقتی طور پر آتا ہے لیکن ماضی اور مستقبل ریاض کی شکل میں کچھ گم ہو کر نمودار ہوتے ہیں جبکہ ریاض کا ماضی، حال اور مستقبل سب کچھ تو عذرا ہی ہے۔ اب اس کی محبت کی چمک بجائے سطحی ہونے کے اور بھی زیادہ پائیدار ہو چلی ہے۔یعنی وہ عشق فلاطونی(Platonic love) کا شکار ہو چکا ہے۔بقول افسانہ نگار:

> ''محبت کتنی ہی عجیب کیوں نہ ہو اور شاعر و نقاد اس کی کتنی ہی قسمیں کیوں نہ کر دیں لیکن جس جذبہ کے ماتحت یہ بیماری شروع ہوتی ہے وہ اتنا عام ہے کہ اس کی مزید تشریح کی ضرورت نہیں...... تنہائی کا خیال، حسن کی کشش، موسم کا اثر، پرُکیف ہوائیں اور خدا معلوم کیا کیا نظریہ ہیں جن سے محبت کا تعلق ظاہر کیا جاتا ہے لیکن میں تو صرف یہ سمجھ سکا کہ شباب و جوانی کے جذبات جو اندھے ہوتے ہوئے اور شائد بہرے بھی، اپنی اندرونی کمی کو پورا کرنا چاہتے ہیں اور شاید یہی وجہ ہے کہ عورت یا مرد جب کسی ایک سے ملتفت ہو کر اپنی محبت کا جواب نہیں پاتے تو کسی اور طرف متوجہ ہو جاتے ہیں، جام پر جام چڑھاتے ہیں یہاں تک کہ ان کی پیاس بجھ جاتی ہے، ان کے دل بھر جاتے ہیں اور جذبات مطمئن:...... لیکن یہ نظریۂ کلیہ نہیں، بار ہا ایسا بھی ہوا کہ کسی نے محبت کی اور تادم مرگ اس پر قائم رہا۔اس سے بے نیاز کہ کوئی اس کی بے لوث محبت کا جواب دے......'' (فارانی)

ریاض کی اسی بے لوث محبت نے اس کی نگاہوں میں محبت کے شرارے بھر دیئے کہ عذرا نے اسے ''فاتحانہ تبسم'' کے ساتھ قبول کر لیا۔قبولیت کے اس درجے نے ریاض کی اس محبت کو کامیاب بنا دیا اور خود عذرا کے دل میں بھی محبت کی وہ کیفیت طاری ہوگئی کہ اسے

ارمان کی سطح تک لے جانا پڑا۔ لیکن حیف کہ یہ ارمان ریاض کی محبت سے سرشار ہو کر بھی اسے ٹھکرانے پر کیوں آمادہ ہوا؟ اور ایک اجنبی کی گرم بانہوں میں کیوں دم توڑتا ہوا مچل رہا ہے؟ افسانہ نگار نے اس کا جواب اس طرح سے دیا کہ:

''عذرا کو اس سے محبت تھی، لیکن وہ ریاض کی طرح محبت کی بے ستون روحانی بلندیوں کی خواہش مند نہ تھی۔ وہ دنیا کی رنگینیاں دیکھ رہی تھی، دنیا کو رنگین سمجھ رہی تھی اور محبت کے رنگین پردوں میں اپنے رنگین جذبات کی تسکین چاہتی تھی۔ اس کا انتظار صحیح معنوں میں ایک عورت کا انتظار تھا اور آخر......

شہاب آہ کہاں تک امیدوار رہے
وہ عیش عیش نہیں جس کا انتظار رہے!

(اقبال)'' (فارانی)

اس جواب کے بعد وہ یہ بھی لکھتا ہے کہ:

''......محبت میں اثر ہوتا ہے، محبت بے غرض ہونا چاہئے، محبت کا اظہار اس کی توہین ہے، محبت میں فنا ہونا زندگی پانا ہے!......اور وہ اپنی زندگی کے ڈرامہ میں انہیں اوصاف کا ہیرو ہونا چاہتا تھا۔ وہ محبت کی خاموش پرورش کر رہا تھا کہ اس میں اثر ہوتا ہے (ریاض) اس نے عذرا کی تمنا کو دل سے دور رکھنے کی کوشش کی محبت بے غرض ہونا چاہئے، اس نے دلی کرب کے باوجود عذرا سے ایک لفظ نہ کہا اور نہ یہ محبت کی توہین ہوتی اور اس نے محبت میں فنا ہونے کی دعائیں مانگیں کہ اس میں حیات تھی، ابدی زندگی بھی غیر فانی۔!'' (فارانی)

افسانہ نگار کا ایک نظریہ محبت کے سلسلے میں واضح ہو گیا کہ محبت بے غرض ہوتی ہے اور اس انتہا تک جس انتہا پر پہنچ کر اقبال نے اپنا نظریۂ عشق واضح کیا کہ عشق کی انتہا اس کا وصال نہیں، ہجر ہے۔ اقبال نے اس نظریے کو سخن کے کینوس پر اجاگر کیا جبکہ سالک نے افسانے میں اس نظریے کی وکالت کی:

''قدر اسی کی ہوتی ہے، جو بعد محنت حاصل ہو اور جو کافی انتظار کے ملے،......'' (فارانی)

سالک کے انفرادی اسلوب بیان میں لکھنوی انداز بیان کی عمل داری ہے کہ کلکتہ

میں رہتے ہوئے بھی ریاض کی ماں لفظ 'بھیا' سے مخاطب کرتی ہے، اس کی پہلی وجہ تو ہے کہ کہانی کلکتہ اور لکھنو کے درمیان پروان چڑھتی ہے۔ دوسری، عذرا ہمیشہ لکھنؤ میں ہی رہی۔ تیسری، افسانہ نگار کی اپنی فصیح لکھنوی زبان ہے۔ ان تینوں کے امتزاج نے ان کے اسلوب اور کردار کے حوالے سے مکالمے اپنے اندر بلا کا حسن لئے ہوئے ہیں۔

عذرا کی شادی ہو جانے کی خبر جب ریاض کی ماں کو بطور اطلاع پہنچتی ہے تو ریاض اسی فکر میں محو انتظار بلکہ سراپا انتظار ہو جاتا ہے تو ریاض کی ماں ریاض کو آواز دیتی ہے جو بیٹھے بیٹھے خواب کی رنگینیوں میں کھویا ہوا تھا۔ سالک کے اسلوب کا یہ انفرادی انداز کچھ اس طرح سے کہانی کو آگے بڑھاتا ہے کہ قاری بھی اس میں محو ہو جاتا ہے اور وہ خود کو بھی وہاں موجود پاتا ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ وہ ریاض کو رقعہ سے متعلق آگاہ کر رہی ہے بلکہ اس کی ماں وہ ہر چاہنے والے قاری سے مخاطب ہے جو اس کے کرب کو اجاگر کرتا ہے۔ مثلاً:

''اس نے کتاب بند کر دی اور کسی خیال میں گم ہو گیا، اس کی نگاہوں میں ایک حسین صورت پھرنے لگی وہ بیٹھے بیٹھے خواب دیکھنے لگا...... پھر وہ یکا یک چونک پڑا، اسے کسی کی چاپ سنائی دی:

''آپ کو بیگم صاحب بلا رہی ہیں!'' ایک نوکر نے آکر کہا اور ریاض فوراً اپنی ماں کے پاس پہونچ گیا۔

''دیکھا بھیا! اسی کو عزیز داری کہتے ہیں!'' ریاض کی ماں نے اسے دیکھتے ہی کہا وہ سمجھ گیا کہ کوئی غیر معمولی بات ہوئی ہے۔

''کیا ہوا اماں؟'' اس نے پوچھا۔

''اپنوں سے تو غیر ہی اچھے۔'' ماں نے اپنی تقریر جاری رکھی۔ ''کہ بیاہ شادی، تیج تہوار میں تو یاد کر لیتے ہیں!''

''لیکن ہوا کیا اماں؟'' ریاض نے پھر پوچھا۔

''ہوا کیا؟ ہوا یہی کہ تمہاری خالہ نے اپنے گھر میں شادی چھیڑی اور دو بول بلا دے کے بھی نہ لکھے، یہی عزیز داری ہے؟ بس آخر میں لکھ دیا کہ چند مجبوریوں کی وجہ سے بہت

عجلت میں شادی کردی گئی ہے، کسی کو بلانے کا موقعہ نہ تھا!''

''شادی؟ کس کی شادی؟ ریاض کو ایک خوفناک شبہ گذرا۔

''عذرا کی اور کس کی، لو یہ خط دیکھو!'' (فارانی)

اس مکالماتی انداز کے بعد سالک کا یہ انداز بھی دیکھئے جہاں زندگی کے فلسفے کی خوبصورت عکس ریزی ملتی ہے اور حوادث سے نبرد آزمائی کا درس بھی۔ ملاحظہ فرمائیے:

''عورت کا حسن زیور سے دوبالا ہوجاتا ہے، چاند کا داغ اس کی دلکشی کا باعث ہے، تاریکی روشنی کی قدر سکھاتی ہے، اسی طرح زندگی میں اگر غم نہ ہوں، حوادث نہ ہوں، ناکامی وناامیدی نہ ہو تو وہ خوبصورت معلوم نہ ہو، اس میں دلکشی باقی نہ رہے، اس کی قدر نہ کی جائے، یہ ٹھوکریں بھی جو ہمیں راہ چلنا بتاتی ہیں......'' (فارانی)

اسی کشمکش میں افسانہ نگار نے ریاض کو تسلی دیتے ہوئے بیانیہ واستفہامیہ انداز تحریر کے حسین التزام کو پیش کیا ہے۔ ریاض بڑبڑاتے ہوئے کہتا ہے:

''تو اس کی شادی ہوگئی؟ مجھے تو خوش ہونا چاہئے کہ وہ میری بہن ہے! پھر میرا دل کیوں بیٹھا جارہا ہے؟ اس کی حرکت کیوں کمزور ہے؟ وہ کیوں بے چین ہیں؟ میری محبت تو بے غرض ہے۔ پھر مجھے وہ تمنا کیوں تھی کہ کوئی اس کا جواب دیتا؟ لیکن میری محبت بالکل بے لوث ہے، وہ اگر کسی دوسرے کی ہوگئی تو ہوجائے، میری محبت قائم رہے گی اور زندگی کی آخری سانس تک یہ ٹھوکریں بھی جو ہمیں راہ چلنا سکھاتی ہیں!'' (فارانی)

عذرا کی شادی کی خبر سننے کے بعد ریاض ان وعدوں کو نہیں بھول پاتا ہے جو عذرا نے کئے تھے جنہیں ریاض اپنی زندگی کا بیش قیمت سرمایہ سمجھتا تھا۔ افسانہ نگار نے ریاض کے محسوسات کو کچھ اس طرح قلم بند کیا ہے:

''میں تمہاری ہوں!'' اس کے کانوں میں عذرا کی آواز گونج رہی تھی، وہ پریشان تھا، اس کی روح بے چین تھی، اس کا دل دھڑک رہا تھا، وہ اطمینان چاہتا تھا، اس کی نظروں میں دنیا کی آبادی، شان وشوکت جاہ وحشم کی کوئی حقیقت نہ تھی اس کی حالت اس بدنصیب کے مانند تھی جس کا اچانک سب کچھ لے لیا گیا ہو، وہ بے چینی کے عالم میں ادھر سے ادھر ٹہلنے

لگا اور پھر ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔اس کے ہاتھ میں وہی کتاب تھی، ''حیات جاوداں'' (فارانی)

ریاض کی تمنائیں حسرتوں میں تبدیل ہو چکی تھیں۔اس کے آنسو خشک ہو چکے تھے۔امید کی کوئی کرن نمودار نہیں ہو رہی تھی۔خوشیوں کا انتظار نہیں تھا، گویا زندگی برباد ہو کر رہ گئی تھی پھر بھی خاموش بیٹھا ماضی کے جھروکوں سے جھانکنے کی سعی کرتا ہے۔خواب کے ٹوٹنے کے بعد وہ خواب کے ٹوٹنے کے پہلے کی تعبیر چاہتا ہے اور پھر وہی خواب دیکھنا چاہتا ہے جو تقریباً ناممکن ہے۔اس کی ٹریجڈی ارسطو کے کیتھارسس کی طرح نہیں، جہاں جذبات کے بھڑکنے کے بعد تذکیۂ نفس کا پایا جانا ممکن ہو۔اس کی کہانی اس طرح نہیں جو سمندر میں اتر کر کشتی کے کسی کونے میں پر آسودہ بیٹھ جائے ،اس کا عشق اس طرح نہیں جہاں شیریں کی موت کی خبر سن کر فرہاد نے خود کو موت کے گھاٹ اتار دیا ہو بلکہ اس کا عشق، (اس کی طمانیت اور اسکا تذکیۂ نفس) زندگی ختم کر دینے میں نہیں بلکہ زندگی جینے میں ہے اور بقول غالب ''زندگی کرنے'' میں ہے۔اس کا تذکیۂ نفس جذبات کو بھڑکانے میں نہیں بلکہ ماضی کو حال میں دیکھ لینے میں ہے اور ممکن ہو تو دو میٹھے بول بولنے میں ہے۔ اکثر لوگ مستقبل کو سامنے رکھ کر حال میں جیتے ہیں مگر ریاض ماضی کو سامنے رکھ کر حال میں جینے پر آمادہ ہے۔یہ اور بات ہے کہ ماضی کو حال کا روپ دینے میں زندگی کے شیڈس بدل جاتے ہیں کچھ ایسی ہی کیفیت عذرا کی زندگی سے جڑی ہوئی ہے۔عذرا بھی دوسرے معشوق کی طرح اپنے ہونٹوں پر ایک خفیف سا تبسم بکھیرتی ہے، اس کی نگاہیں فخر سے چمک اٹھتی ہیں اور دل میں تاسف آمیز خوشی رقصاں ہوتی ہے۔اس امید کے ساتھ کہ اس پر اس کی محبت کا رنگ ہی چڑھا ہے۔بقول افسانہ نگار:

> ''لیکن اس کی یہ وقتی مسرت فانی تھی، اسے بہت جلد وہ زمانہ یاد آ گیا جب یہی ریاض اس کی تمناؤں کا مرکز تھا۔اس کی نگاہوں میں وہ ریاض پھر رہا تھا جس کے بازو بھرے ہوئے تھے، جس کی نگاہیں چمکیلی تھیں، جس کا چہرہ روشن تھا، جس کی آواز دلکش تھی لیکن آج اس کے سامنے وہ ریاض تھا جس کے جسم پر گوشت نہ تھا، جسکی نگاہوں میں چمک نہ تھی، جس کا چہرہ زرد تھا، جس کی گفتگو میں حسرت تھی، جس کی آواز میں درد تھا۔

عذرا کے دل پر ایک چوٹ سی لگی، وہ سامنے سے ہٹ گئی، وہ رو رہی تھی‘‘ (فارانی)

ان مسرتوں اور بے چینیوں کے ساتھ ریاض مرا نہیں تھا مگر مرنے کے لئے جی رہا تھا۔ عذرا کی شادی کے کئی برسوں کے بعد جب ریاض پہلی بار لکھنؤ جاتا ہے تو ایک نوع کی تثلیثی کش مکش کا شکار ہوتا ہے۔ افسانہ نگار یہاں تینوں کی ملاقات کراتا ہے، بالخصوص فارانی سے جو حسن رسید، جامہ زیب اور تجربہ کار کے علاوہ خود غرض بھی ہے۔ افسانہ نگار نے یہاں کہانی میں ایک نیا موڑ دیا ہے وہ اس طرح کہ عذرا کو اچانک دل کا دورہ پڑتا ہے اور سبھی پریشان ہو اٹھتے ہیں لیکن ریاض کی پرخلوص پریشانی نے پرخلوص خدمت پر آمادہ کیا جو عذرا کی صحت یابی میں معاون ثابت ہوئی۔ اسی دوران فارانی کی عمیق نظروں نے ریاض و عذرا کی کیفیتوں کا مطالعہ کیا۔ اس کی زندگی نے ایسی کیفیتیں پہلے بھی دیکھی تھیں، ایسے حادثات پہلے بھی رونما ہوئے تھے۔ وہ سب کچھ سمجھ رہا تھا، اس لئے ایک کریہہ مسکراہٹ کے ساتھ اپنے وقت کا انتظار کرتا ہے اور یہ وقت اس کے دلی ارادے کی تکمیل کا پتہ دیتا ہے۔

کہانی آگے بڑھتی ہے اور دونوں بچھڑے دیوانے آپس میں بشکلِ تیمارداری قریب ہوتے ہیں لیکن گفتگو نہیں ہوتی ہے۔ دل میں گھٹتے ہوئے ارمان زبان پر لفظ بن کر تو آتے ہیں مگر ہونٹوں کی زینت نہیں بن پاتے۔ خاموشی طاری رہتی ہے بلکہ خاموشی بحران صدا بن جاتی ہے جہاں دونوں چپ ہیں۔ دونوں جھکی جھکی سی نظروں سے ایک دوسرے کو دیکھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ عذرا گفتگو کا ایسا پہلو تلاش کرنا چاہتی ہے جو ریاض کیلئے بارِ خاطر نہ ہو۔ کسی قدر سوال و جواب کا سلسلہ آگے بڑھنے لگتا ہے۔ دل کی کیفیتیں واضح ہونے لگتیں ہیں۔ رسماً بات چیت کے بعد ایک دن عذرا ریاض سے یہ بھی کہہ دیتی ہے کہ ’’تم شادی کرلو!‘‘ یہ سن کر اس کا دل دھک سے ہو جاتا ہے کیونکہ وہ یہ سننا نہیں چاہتا۔ اس کی تمنائیں، اس کے ارمان، اس کی زندگی اور شادی کی آرزو بہت کچھ ختم ہو چکی ہوتی

ہے۔ کسی اور کی زندگی تباہ کرنا اس کا مقصد نہیں بلکہ اس کے لئے اس دنیا میں اب اگر کوئی دلکشی ہے تو وہ عذرا کی محبت میں خود کو فنا کر دینا ہے۔

یہاں ریاض کی زندگی وقف ہونے کے لئے تیار کھڑی ہے، وہاں فارانی جو عذرا کی صحت یابی کی خوشی میں پارٹی دے کر ریاض کے بیتے دنوں کی یاد تازہ کر رہا ہے اور اپنے شک کو مزید مستحکم کر رہا ہے۔ پارٹی ختم ہوتی ہے اور ریاض شدید بخار میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ عذرا، ریاض کی تیمارداری کرتی ہے۔ حالت اور بھی نازک ہوتی چلی جاتی ہے کہ ریاض کی ماں آ جاتی ہے اور مخاطب ہوتی ہے:

"کیسے ہو بھیا۔؟"

افسانہ نگار نے وقفے وقفے سے اس کہانی میں اپنے نظریئے کو فروغ بھی دیا ہے جیسے یہاں "ماں" کی اہمیت کو واضح کیا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ:

> "......ماں کی ہستی وہ ہستی ہے جس کے قریب آ کر ہم سب کچھ ہونے کے باوجود خود کو اک طفل سادہ سمجھتے ہیں، ماں کی آغوش میں ہمیں وہ اطمینان محسوس ہوتا ہے کہ کچھ دیر کے لئے ہم سب کچھ بھول جاتے ہیں، ہمیں کچھ یاد نہیں رہتا سوائے اس کے کہ ہم ایک ایسی جنت میں ہیں جہاں کسی کا خوف نہیں، کوئی تکلیف نہیں، کسی مصیبت کی امید نہیں، جہاں آرام ہے، ابدی مسرتیں ہیں روحانی، جہاں دینا کی دشمنی ہم تک نہیں پہونچ سکتی، جب ہماری تمنائیں پوری نہیں ہوتیں جب ہماری قسمت ناکامی کی انتہا پر آ جاتی ہے، جب دنیا کا ہر گوشہ ہمارے لئے تاریک ہو جاتا ہے۔ جب ہم ساری دنیا کے ٹھکرائے ہوئے آتے ہیں تو ماں کی آغوش میں ایک نئی دنیا میں بس جاتے ہیں۔ اس غربت زدہ مایوس بچہ کی مانند جو بھوک سے بیتاب ہو کر ہر ایک کے سامنے گیا ہو اور پھر تھک کر اپنی ماں کی آغوش میں گر پڑا ہو۔" (فارانی)

افسانہ نگار جہاں یاس میں بھی آس کی شمع روشن کئے ہوئے ہے، وہاں سماجی رسم و رواج کا پاس بھی رکھتا ہے۔ مثلاً وہ "جمعرات" کے دن کو مریض کیلئے مشکل اور پر اذیت

سمجھتا ہے کیونکہ اسی دن ریاض کی حالت بد سے بدتر ہوتی گئی تھی۔ یہاں موت اور ہمت کی کشمکش کہنا درست نہیں ہوگا بلکہ قیامت سے قیامت تک کی کشمکش کا معاملہ درپیش ہے کیوں کہ ریاض زندہ تھا ہی مرنے کیلئے اور اس موت کیلئے جس کا سبب بھی صرف اور صرف محبت ہے تاکہ معشوق پر یہ واضح ہو سکے کہ عاشق نے اپنی زندگی کی قیمتی ساعتیں اسی محبت میں نچھاور کی تھیں۔ یا یوں کہا جائے کہ ایک عاشق نے اپنی محبت کا فرض نبھایا ہے۔ یہ بات سچ ثابت ہوئی اور وہ دنیائے فانی سے ہمیشہ کے لئے رخصت ہوگیا۔

اب اس مثلث کے ایک زاویے کے کم ہونے پر بھی افسانہ نگار نے کہانی میں جان باقی رکھی ہے۔ وہ بھی ریاض جیسے عاشق کی موت کے بعد۔ کہانی کی آخری عبارتیں ملاحظہ کیجئے تاکہ اس کی اصلیت سے واقفیت ہو سکے:

''کیوں کیا سوچ رہی ہو......؟'' فارانی نے اچانک پس پشت آکر کہا پھر اس کے قریب بیٹھ کر اس کے بالوں پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بولا۔

''کس خیال میں ہو......؟''

''سوچ رہی ہوں کہ بہت سی ایسی کلیاں بھی ہیں جو کھلنے سے قبل ہی مرجھا جاتی ہیں، مجھے ان کی بدنصیبی پر ترس آتا ہے، کیوں ترس آنا چاہئے نا......؟''

''مجھے اتنی فرصت نہیں جو کھلنے والے پھول اور مرجھانے والی کلیوں کا گفتار رہوں''۔ فارانی نے ہنس کر جواب دیا۔ عذرا چپ ہوگئی۔ اس کے چہرے سے معلوم ہوتا تھا کہ کسی خاص جذبہ کو دبانے کی کوشش کر رہی ہے۔ فارانی کے کوٹ کا کالر موڑتے ہوئے بولی۔

''کیا تم نے کسی سے محبت بھی کی ہے؟''

فارانی مسکرانے لگا، اس کی نگاہیں انتقامانہ جھلک سے معمور ہوگئیں۔

''اور تم نے؟''

عذرا سنبھل کر بیٹھ گئی۔

''کیا تم سچ سچ سننا چاہتے ہو......؟''

''یقیناً!''

عذرا کے دماغ میں خیالات کی جنگ شروع ہوگئی۔ کہے یا نہ کہے، پھر یکا یک اس کے چہرہ پر سنجیدگی آ گئی۔ ہر بڑا کر دھیمی آواز میں بولی:

''تمہیں یاد ہے میرا ایک خالہ زاد بھائی تھا، ریاض!''

''ہاں!''

''جو کبھی لکھنؤ آتا تھا اور جس نے میری بیماری میں بڑی محبت سے تیمارداری کی تھی......''

''ہاں......!''

''اور ہمارے جلسے سے واپس جا کر بخار میں مبتلا ہوگیا، جس کے علاج کے لئے تم نے لکھنؤ کے اچھے اچھے ڈاکٹروں کو بلایا تھا اور جس نے آخر کار میرے سامنے ہمیشہ کے لئے اپنی آنکھیں بند کر لی تھیں......''

''ہاں......''

فارانی جیب سے سگرٹ کیس نکالا اور ایک سگرٹ سلگا کر ہلکے ہلکے تین چار کش لگائے۔ ''لیکن تمہیں یہ بھی معلوم ہے کہ اس کی فوری موت کا کیا سبب تھا؟'' فارانی نے پوچھا۔ ''نہیں......'' عذرا نے آنکھوں میں مچلتے ہوئے آنسوؤں کو خشک کرتے ہوئے کہا۔ ''میں نے اسے زہر دے دیا تھا، آئیس کریم میں!'' (فارانی)

کہانی کا اختتام اس ڈرامائی انداز میں ہوتا ہے کہ قاری نقش بر دیوار ہو جاتا ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ کہانی ٹریجڈی سے شروع ہو کر ٹریجڈی پر ختم ہوتی ہے۔ یہ افسانہ نگار کی اجتہادی فکر اور ڈرامائی اسلوب بیان پر دال ہے۔

''اچھوت'' اور ''فارانی'' جیسے حقیقت پسند رومانی افسانوں کے بعد افسانہ ''صندوق'' کا مطالعہ کیجئے تو اس برہنہ حقیقت کی عکاسی ملے گی جہاں قدروں کی شکست وریخت اور تہذیبی بحران اپنی انتہا پر ہے۔

افسانہ نگار نے افسانے کا باضابطہ آغاز کرنے سے پہلے زمانے کے سیاسی وسماجی اور معاشی واخلاقی حالات قلم بلند کئے ہیں کہ سماجی وتمدنی ناہمواریاں ہماری زندگی کا اٹوٹ

حصہ بن چکی ہیں۔ ہم بظاہر پڑھے لکھے اور تہذیب یافتہ کہلاتے ہیں لیکن عملی طور پر ہم نہ تو علمی مظاہرہ کرتے ہیں اور نہ ہی تہذیبی بلکہ ہمارا مقصد زندگی محض مادی ضرورتوں کی تکمیل ہے۔ ان کی تکمیل میں اقدار کا گلہ گھونٹنا اور اخلاق کا جنازہ نکالنا کچھ معیوب نہیں سمجھا جاتا۔ افسانے کا ایک کردار رشید ایسا ہی واقعہ اپنی بستی کا سناتا ہے کہ آج کل کے تہذیب زدہ لڑکے اپنے بزرگوں کے ساتھ کیسا سلوک کرتے ہیں۔

دراصل سالکؔ کا یہ افسانہ، افسانہ نہیں بلکہ حقیقت ہے۔ یہ حقیقی واقعہ لکھنؤ میں انہیں ان کے ایک بزرگ نے سنایا تھا، جو لوگوں کی اصلاح کیلئے بھی تھا۔ اس میں کرداروں کے نام بھی تقریباً وہی ہیں لیکن سالکؔ صاحب نے اپنی فنی چابکدستی سے اس واقعہ کو فن کا درجہ دے دیا۔ یہ اور بات ہے کہ ''صندوقچہ'' کی کہانی سید فرزند احمد صغیر بلگرامی نے اپنے ناول ''جوہر مقالات (1886) میں پیش کی لیکن اس میں کرداروں کے نام الگ اور کہانی مختلف ہے جبکہ انجام ایک ہی ہے۔

''افسانہ صندق'' 22/ستمبر 1938ء میں تخلیق کیا گیا (وہ زمانہ پریم چند کے عروج کا تھا۔ جبکہ کرشن چندر بیدی اور منٹو لکھنے کی کوشش میں جٹے تھے)

قصے کا آغاز رشید کی زبانی ہوتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ میری بستی سے پانچ میل دور ایک اور بستی ہے جہاں منشی امیر احمد کا خاندان آباد ہے۔ منشی جی پرانے خیالات کے بزرگ تھے مگر قدامت پرست نہ تھے، یہی وجہ ہے کہ اعلیٰ تعلیم کے لئے انہوں نے اپنے دونوں لڑکوں کو علی گڑھ روانہ کیا تھا۔ منشی جی کا دل بہت ہی نرم تھا۔ وہ ملنسار اور نیک خوانسان تھے۔ دوستوں کا حلقہ محدود ہونے کی وجہ سے ان کا صرف ایک ہی دوست تھا جس کا نام لالہ پریم چند ساہوکار تھا۔ وہ منشی جی کے مکان کے سب سے قریبی بھی تھے اور جن سے اپنی دلی بات کہہ سکتے تھے۔

منشی جی ایک روشن مزاج شخص تھے انہوں نے ایک دن سوچا کہ اس بڑھاپے میں

بچوں کی طرف سے محبت اور پیار میں کوئی کمی نہیں اور وہ دیکھ ریکھ بھی ان کی کرر ہے ہیں۔ انہیں یہ خدشہ لاحق ہو گیا کہ ان کے مرنے کے بعد کہیں ایسا نہ ہو کہ دونوں بھائی آپس میں لڑ بیٹھیں اور بسا بسایا خاندان اجڑ جائے۔ بہتر ہو کہ اپنی زندگی میں ہی جائداد کا بٹوارہ کر دیا جائے۔ یہ بات اس نے اپنے عزیز دوست لالہ پریم چند ساہوکار کو بتائی تو انہوں نے تجربے کی بنیاد پر منشی جی کو یہ مشورہ دیا کہ اگر کل جائیداد کو بانٹ دیا گیا تو تمہارے پاس کیا رہے گا اور اگر کچھ نہ رہا تو یہ بھی ممکن ہے کہ تمہارے بچے بھی تمہارے نہ رہیں گے۔ اس لئے بہتر ہے کہ یہ خیال دماغ سے نکال دیا جائے۔

لالہ کی بات سن کر منشی جی کی پریشانی بڑھ گئی۔ وہ رات بھر سو نہیں پائے۔ اس بے چینی سے جلد ہی وہ آزاد ہونا چاہتے تھے اس لئے لالہ کی باتوں کا خیال نہ کرتے ہوئے چپکے سے رجسٹرار سے ملے اور اپنی جائداد کا بٹوارہ کر دیا۔ اس کی اطلاع اپنے دوست لالہ کو بھی نہیں دی کہ کہیں وہ اس سے کبیدہ خاطر نہ ہو جائے۔ منشی جی اب لالہ کے مکان کے پاس سے گزرنا بھی بند کر چکے تھے لیکن لالہ کو اس حقیقت کا علم ایک دن ہو ہی گیا۔ انہوں نے ملاقات پر صرف اتنا کہا کہ:

''لیکن تم نے برا کیا۔''

منشی احمد میاں کی عزت پہلے سے اور بھی زیادہ ہونے لگی اور زبان کھلنے سے قبل ہی مطلوبہ چیزیں ان کے سامنے حاضر ہو جاتیں۔ لڑکے اور بہوؤں نے خدمت میں کوئی کسر نہ چھوڑی لیکن جلد ہی منشی جی کی عزت تو کجا، کوئی ان کی دیکھ ریکھ بھی نہیں کرنے والا تھا۔ ان کی حالت غیر ہوتی گئی۔ اس مصیبت کی گھڑی میں لالہ جی یاد آئے۔ وہ آئے تو دیکھا کہ منشی جی اپنی ٹوٹی چارپائی پر ساکت وصامت بیٹھے ہیں۔ کچھ دیر کی خاموشی کے بعد منشی جی کا طلسمِ سکوت ٹوٹا:

''کیوں بھائی، مجھ سے کیا خطا ہوئی کہ تم نے آنا ہی چھوڑ دیا؟ سچ ہے بُرے وقت کوئی

کسی کا شریک نہیں ہوتا۔تم نے بھی نگاہیں پھیر لیں''۔نگاہیں وگاہیں تو خیر کیا پھر لیں''۔
لالہ بولے''لیکن میں نے جان کرآنا کم کر دیا تھااس لئے کہ مجھے دیکھ کرتمہیں پچھلی باتیں
یادآجائیں اور تمہیں تکلیف ہو۔''(صندوق)

یہ سن کرمنشی جی پھر خاموش ہو گئے، کیوں کہ انہیں اپنا ماضی یاد آ گیا اور آنکھیں
سیلاب بن گئیں، اسی حالت میں وہ کہہ بیٹھے:

''تمہارا خیال سچ تھا!''

افسانہ نگار نے لمحاتِ گذشتہ کی عکاسی صاف طور پر کی ہے:

''وقت گذرتا رہا۔دنیا کی عمر کم اور منشی جی کی عمر زیادہ ہوتی گئی۔عمر کے ساتھ ان کی
تکلیفیں بھی بڑھتی رہیں، بیٹوں اور بہوؤں کی نگاہوں میں ان کی ہستی ایک بے مصروف،
تکلیف دہ، فضول چیز تھی، اس لئے بے چارے کی قدر نہ کی جاتی، ان کی تکلیفوں کا خیال نہ
کیا جاتا، ان کی ضرورتوں کی شنوائی نہ ہوتی۔ضعیفی کا سب سے بڑا دشمن دمہ، اکثر ان کی
پسلی پسلی توڑ دیتا مگر کوئی دھیان تک نہ دیا، کوئی پشت تک نہ سہلاتا، کوئی یہ بھی نہ پوچھتا کہ
بابا تمہارا کیا حال ہے! منشی جی دل ہی دل میں موت کی دعائیں مانگتے، مگر موت کمبخت بھی
بُرے وقت آنے سے انکار کر رہی تھی!''(صندوق)

محولہ اقتباس سے منشی جی کی بیچارگی ظاہر ہوتی ہے کہ کس طرح سے ان کی آخری
عمر گزر رہی تھی کہ موت کی دعائیں مانگنے پر مجبور ہوئے۔لالہ پریم چند نے کئی بار ان کو نجات
دلانے کی سوچی لیکن یہ سوچ کر رہ گئے کہ منشی جی بہت ہی خوددار انسان ہیں، وہ ان کی
گزارش قبول نہیں کریں گے۔

کئی دن یونہی گزر گئے، منشی جی کی حالت بد سے بدتر ہوتی گئی۔اسی دوران لالہ
پریم چند اپنے علاقے کو چھوڑ کر کسی دوردراز علاقے میں مستقل سکونت کی غرض سے جانے
والے تھے کہ ایک مزدور کے ساتھ آئے جس کے سر پر ایک صندوق تھا۔آتے ہی آواز دی:

''لیجئے منشی جی، یہ اپنی امانت، اس کیلئے پرسوں میرے گھر میں چوری ہوتے ہوتے رہ گئی
اور میں اب یہ مکان بھی چھوڑ رہا ہوں، اس لئے چاہتا ہوں کہ آپ کی چیز آپ کے سپرد

کردوں، بھگوان جانے بعد کو کیا ہو، کیا نہ ہو، کسی کا بوجھ تو اپنے سر پر نہ رہے۔" (صندوق)

منشی جی کو حیرت ہو رہی تھی۔ وہ بولنا چاہتے تھے مگر لالہ جی نے ایسا موقع ہی نہیں دیا اور مزدور کو حکم دیا کہ زمین کھودو اور اس صندوق کو اس میں حفاظت سے رکھ دو۔ صندوق کو محفوظ طریقے سے رکھ دیا گیا۔ لالہ جی منشی کے کان میں کچھ کہہ کر چلے گئے۔ منشی جی وہیں کھڑے سوچتے رہے۔ ان کی آنکھیں اشکبار ہو گئیں۔

لالہ جی کے اس کارنامے نے منشی جی کی زندگی کے رنگ ہی بدل ڈالے۔ بیٹے اور بہوئیں آپس میں باتیں کرنے لگے اور ان کی عزت پھر ہونے لگی۔ یعنی گلزار حیات میں پھر سے بہار آ گئی تھی۔

افسانہ نگار نے حقیقت کو بیان کرتے ہوئے یہ بھی واضح کر دیا کہ اس عمر میں باپ کی کوئی عزت نہیں تھی بلکہ صندوق کی چاہت نے عزت کرنے پر مجبور کر دیا تھا۔ جب منشی جی کی حالت کچھ زیادہ ہی ابتر ہونے لگی تو دنیاداری کا خیال کر کے لڑکوں نے ڈاکٹر کو بلایا۔ جب ڈاکٹر نے مایوس کن لہجے میں جواب دیا تو لڑکوں کے چہرے کھل اٹھے کہ اب بہت جلد صندوق ان کے قبضے میں ہوگا۔ ان حالات کو افسانہ نگار نے بڑی خوبصورتی سے پیش کیا ہے:

"پھر حالت بہت خراب ہو گئی، سانس کی رفتار میں فرق آ گیا، منشی امیر احمد کے مرجھائے ہوئے چہرہ پر موت کی رونق آ گئی......

مریض کے بچنے کی کوئی امید نہیں، وہ (ڈاکٹر) اس میں کچھ نہیں کر سکتا۔ دونوں بھائیوں کے چہرے تمتما اٹھے، باپ کے غم میں نہیں، صندوق ملنے کی خوشی میں! آخر وہ وقت آ گیا جب منشی امیر احمد کی حسرت انگیز ضعیفی کو اس رنگین دنیا کے خوبصورت پنجوں سے چھڑانے کے لئے موت خاموشی و سکوت کے ساتھ آگے بڑھی۔ منشی جی کے چہرے پر اطمینان کی ایک عجیب چمک آ گئی، آنکھیں کھلیں کہ ایک بار اور کچھ دیکھ لیں اور پھر بند ہو گئیں، دنیا کی طاقت اب انہیں کھول نہیں سکتی تھی!" (ایضاً)

افسانہ نگار نے وقت کی ستم ظریفی، حسرت و یاس میں لپٹی کہولت اور تہذیبی زوال کو کس ہنرمندی سے پیش کیا ہے کہ سارا سماج اور اس کی تہہ میں ابھرتی ڈوبتی قدریں ہماری نگاہوں کے سامنے رقص کرنے لگتی ہیں کہ بیٹوں اور بہوؤں نے کس طرح پُر تکلف موت کی دعوت دی، اس امید کے ساتھ کہ ''صندوق'' میں تو مال و اسباب پڑے ہوں گے۔ یعنی باپ بیٹے کا رشتہ جو کئی معنوں میں اہمیت کا حامل ہے، سب ٹوٹ کر بکھرتا دکھائی دیتا ہے۔ مصنوعی دنیا میں ہر کچھ مصنوعی ہی لگتی ہے، خود غرضی کبھی علامت بن کر سامنے آتی ہے، تو کبھی دوسری شکلوں میں، جسے صرف محسوس کیا جا سکتا ہے۔ اب اس افسانے کا ڈرامائی اختتام ملاحظہ فرمائیے:

''اب صندوق نکلنے کا وقت آ گیا تھا۔ مزدوروں کو بلانا مناسب نہ سمجھا گیا، ممکن تھا کہ وہ پورے گاؤں میں مشہور کر دیتے کہ اتنا مال نکلا۔ اس لئے دونوں بھائی اور ان کی بیویوں نے خود صندوق نکالنے کا ارادہ کر لیا۔ سب صندوق پر چمٹ گئے، مٹی کھودنا شروع کی۔ کسی کا کرتا پھٹا اور کسی کا ڈوپٹہ۔ اللہ اللہ کر کے صندوق باہر نکالا تو اس میں ایک مضبوط قفل پڑا ہوا تھا۔

''ابا جان نے کس حفاظت سے اسے رکھا تھا!'' ایک نے ہانپتے ہوئے تعجب سے کہا۔

''یقیناً'' اس میں کم مال نہ ہوگا۔'' دوسرے نے دلی زبان سے تائید کی۔

''اور کیا ورنہ وہ اپنے سامنے اسے زمین میں کیوں گڑواتے؟''

''اور تمہیں لالہ کا پکار کر کہنا بھی یاد ہے کہ لیجئے سنبھالئے اپنا عذاب..............

کلہاڑی کی سخت ضربوں سے قفل ٹوٹ گیا، ڈھکنا اٹھایا گیا، ٹاٹ اور پرانے کپڑوں کی تین چار تہیں جیسے ہی اٹھائی گئیں کہ دونوں بہویں چیخ مار کر پیچھے ہٹ گئیں، دونوں بھائی سر سے پیر تک کانپنے لگے...... صندوق میں پہلے کچھ پھٹے پرانے کپڑے تھے اور اس کے بعد چند نفیس سرخ اینٹیں اور بہت سے رنگین و زنی پتھر!!!'' (ایضاً)

اس افسانے سے جہاں سالکؔ کی ندرت فکر سامنے آتی ہے وہاں یہ بھی احساس ہوتا ہے کہ انہوں نے اتنی کم عمری میں اتنا اچھوتا افسانہ لکھ ڈالا۔ ساتھ ہی زبان و بیان پر اتنی

قدرت کہ ایک عمر جینے کے بعد بھی یہ ہنر سبھوں کو نصیب نہیں ہوتا۔

سالک لکھنوی کا ایک افسانہ ''قمار باز!'' رسالہ ''ہمایون'' (اگست 1935ء) کی زینت بنا۔ یہ افسانہ قیصر کے نام سے چھپا تھا جس کی توجیہہ خود افسانہ نگا نے پیش کر دی ہے، اس لئے اس کی تفصیل سے گریز کیا جاتا ہے۔

سالک کے افسانوں کی یہ خوبی ہے کہ ان کا آغاز بڑا ہی پرُکشش ہوتا ہے کہ قاری ابتدا سے ہی دلچسپی لینے لگتا ہے اور جیسے جیسے وہ آگے بڑھتا ہے، اس پر جذب وکیف طاری ہونے لگتا ہے۔ ساتھ ہی اس کا سسپنس اور وحدت تاثر قاری کو باندھے رکھتی ہے اور اختتام بھی بڑا چونکا دینے والا ہوتا ہے۔ اسے افسانہ نگار کی ایک بڑی خوبی سے تعبیر کرنا چاہئے کہ وہ قاری کو آخر آخر تک سمیٹ کر رکھے۔ اس افسانے کی ابتدا ''قمار باز'' کے تعارف سے یوں ہوتی ہے:

''سامنے نوٹوں کا بنڈل پڑا تھا۔ جان نے چپکے سے اپنے پیروں کے نیچے دبا لیا اور پھر پیر کھجانے کے بہانے جھک کر نوٹ جیب کے حوالہ کر دیا...... وہ مشہور جواری تھا۔'' (قمار باز)

جواری ان سو روپوں کو لے کر ایک مشہور قمار خانے میں ہار کر جب واپس آتا ہے تو دیکھتا کیا ہے کہ وہاں ایک جوان سی لڑکی کچھ ڈھونڈ رہی ہے۔ اسے ہلکی سی خلش کا احساس ہوتا ہے اور پوچھ بیٹھتا ہے۔ یہاں سے کہانی کی کشمکش شروع ہوتی ہے:

''آپ کیا ڈھونڈ رہی ہیں؟'' اس نے زبردستی مسکراتے ہوئے پوچھا۔

''جی، میں نے سو روپیہ کی ایک چک بھنائی تھی مگر بنک سے کچھ ہی دور گئی ہوں گی کہ معلوم ہوا کہ نوٹوں کا بنڈل کہیں گر گیا، میں وہی ڈھونڈ رہی ہوں!''

جان نے ادھر اُدھر دیکھتے ہوئے کہا...... ''ہوں، تو تم نوٹ ڈھونڈ رہی ہو۔ سو روپیہ کے نوٹ، اچھا اگر میں بتا دوں؟''

لڑکی جلدی سے چلا اٹھی...... ''تم کو معلوم ہے؟ تو پھر بتاؤ مجھے کہاں ہیں وہ نوٹ؟''

اچھا ہوا کہیں کسی اور کے پہلے پڑتے تو غضب ہی ہو جاتا، وہ لے کے غائب ہو جاتا اور

میں ہاتھ ملتی رہ جاتی۔''

جان نے رک رک کر کہا...... ''مگر وہ نوٹ...... اب میرے پاس...... کہاں؟''

''کیا کہا؟''

جان نے صاف صاف کہا...... ''وہ نوٹ اب میرے پاس نہیں ہیں۔''

لڑکی کو غصہ آ گیا...... ''کیا کہا تم نے؟ نوٹ اب نہیں ہیں؟ تو پھر گئے کہاں؟''

''میں ہار گیا!''

''ہائیں! ہار گئے! کیا زیادہ پی گئے ہو؟ کیسے ہار گئے، کیوں ہار گئے، کیا حق تھا تم کو ہارنے کا! بولو!'' (ایضاً!)

ان مکالموں کے بعد قمار باز کی زبان سے یہ جملے ادا ہوتے ہیں جو زندگی کی حقیقت کو واضح کرتے ہیں:

''معاف کیجئے گا خاتون! زندگی کا نام ہی ہے ہار جیت اور ہار جیت کے جوار بھاٹے کا نام زندگی۔ یہ دنیا اور اس دنیا کی کل کائنات ہار جیت کے فیض سے قائم ہے۔ کل کیا ہوگا، کون جانتا ہے اور پھر...... اور پھر......'' (ایضاً)

اس طرح کی نوک جھونک اس قمار باز اور لڑکی میں ہوتی رہتی ہے۔ وہ ''وقت'' اور ''زندگی'' کو ایک جوا ہی سمجھتا ہے، جس کی قسمت میں جو آیا وہ بھی جوا کی بدلی ہوئی شکل ہی ہے۔ قمار باز لڑکی کی آنکھوں میں آنسو دیکھ کر کچھ افسردہ سا ہو جاتا ہے۔ وہ اس لڑکی سے پھر دس روپے کا نوٹ طلب کرتا ہے، اس امید پر کہ قسمت اس بار دغا نہیں دے گی۔ لڑکی کسی طرح راضی ہو جاتی ہے اور دس روپے کا نوٹ اس کے حوالے کر دیتی ہے۔ جان جب قمار خانے کی طرف قدم بڑھاتا ہے تو لڑکی بہت ہی دھیمے لہجے میں اس سے کہتی ہے:

''واپس آؤ گے نا؟''

اس کے جواب میں جان کہتا ہے:

''ضرور، جواری کبھی جھوٹ نہیں بولتا!''

ایک جواری کا ایمان کتنا پختہ ہوتا ہے کہ وہ جھوٹ نہ بولنے کا دعویٰ کرتا ہے۔ جبکہ لڑکی دس روپے دے کر خود کو مطمئن نہیں کر پاتی ہے کہ ایک جواری اتنا ایماندار کیونکر ہونے لگا۔ اسے تو بس ایک نشہ ہوتا ہے جوئے کا' لیکن اس لڑکی کو اس وقت حیرت کی انتہا نہیں ہوتی جب جواری ان روپوں سے بازی جیت لیتا ہے اور کہتا ہے:

''تو دیکھو جیت لایا۔ میں نے کہا تھا نا کہ دنیا کی ہر شئے میں جوا ہے اور دنیا کی ہر شئے جواری!''

جان کی ایمانداری دیکھ کر لڑکی کے دل میں لالچ پیدا ہو جاتا اور دوبارہ اسے روپے دیتی ہے کہ وہ مزید جوا کھیلے اور جیت کر آئے۔ مگر کہانی میں وہی کشمکش ہے اور اس کا انجام بھی وہی ہے جو اصل میں افسانہ نگار دنیا کے سامنے پیش کرنا چاہتا ہے کہ سب کچھ قسمت ہے اور لالچ بُری شئے ہے۔ اس افسانے کا اختتام جان کی ایک سطری خط سے یوں ہوتا ہے۔

''قسمت کی ہار نے جیت کا پانسہ الٹ دیا، میں بازی ہار گیا...... جان!''

سالک لکھنوی کا ایک عمدہ، افسانہ ''سزا'' ہے۔ اس میں دارجلنگ اور یہاں کی پرفضا مناظر کی عکاسی کی گئی ہے کہ مظاہر فطرت کسی کو مسحور کرنے کیلئے کافی ہیں۔ افسانے کا آغاز یوں ہوتا ہے:

''یہ بادلوں کی دنیا تھی، ہر طرف بادل ہی بادل تھے، بھورے غلیظ، خوشنما، پہاڑوں کی چوٹیوں سے ٹکراتے ہوئے، ہواؤں کے تھپیڑے کھاتے ہوئے، گرجتے، برستے، بڑھتے ہوئے بادل۔'' (سزا)

اور یہی بادل دارجلنگ کی کوہستانی چوٹیوں کو بارونق بناتے ہوئے ہمیں بھی دامن کشاں گزرنے نہیں دیتے۔ افسانہ نگار بھی اس افسانے کی تخلیق سے قبل دارجلنگ کئی بار جا چکا ہے، اس لئے اس کی جزئیات سے پوری طرح آگاہ ہے۔

کہانی آگے بڑھتی ہے۔ افسانہ نگار اور اس کا ساتھی دونوں باتیں کرتے رہتے

ہیں کہ درمیان میں چائے خانے کا ایک بڈھا مالک آتا ہے اور داستان سنانے پر آمادہ ہوتا ہے۔ وہ بڈھا اپنا تعارف اپنی عمر اور ساخت کے لحاظ سے پیش کرتا ہے جسے طول سمجھ کر بار بار یہ دونوں حضرات درمیان میں مداخلت کرتے ہیں، جسکے جواب میں وہ بڈھا کہتا ہے۔

''مگر حضور، یہ دنیا بھی تو ایک داستان ہے، ایک طویل داستان، اس سے کوئی نہیں گھبراتا۔'' (سزا)

وہ کہانی کو آگے بڑھاتا ہے۔

وہ بڈھا پہاڑی نہیں تھا لیکن پہاڑوں پر رہتے ہوئے خود بھی پہاڑی ہو گیا تھا۔ ان پہاڑی نوجوان کے درمیان وہ بھی رہتے رہتے بات بات پر لڑ بیٹھنے والا بدمزاج اور وحشی بن گیا تھا۔ یہ بدمزاجی اور وحشیانہ پن اصل میں پہاڑیوں پر رہنے والوں کی حقیقی زندگی کا عکاس ہے کہ وہ بات بات پر آپس میں لڑ پڑتے ہیں اور کسی وقت کسی کی جان بھی لے سکتے ہیں۔ افسانہ نگار گاہ بگاہ مناظر قدرت کو بھی پیش کرتا جاتا ہے تاکہ اکتاہٹ کا احساس نہ ہو اور قاری ان مناظر سے لطف اندوزی کے ساتھ آگے کا سفر طے کرے۔ مثلاً:

''میرے ساتھی کو شاید خنکی محسوس ہونے لگی تھی۔ اس نے گلوبند کو کانوں تک لپیٹ لیا۔ بادل ایک دوسرے سے ٹکرا رہے تھے۔ بے تاب تھے پہاڑوں کی کنواری چوٹیوں کو چھونے کیلئے۔ بڑھ رہے تھے، گرج رہے تھے، برس رہے تھے، یہ بادلوں کی دنیا تھی'' (سزا)

کہانی میں اس بڈھے کے علاوہ ایک دوسرا نوجوان اُس گاؤں میں نظر آتا ہے اس کا خاکہ افسانہ نگار یوں پیش کرتا ہے۔ دیکھئے:

''پھر ہمارے چھوٹے سے پہاڑی گاؤں کے لئے ایک نیا واقعہ پیش آیا۔ ایک دن میری ہی طرح سے ایک اور نوجوان اس گاؤں میں نظر آیا۔ دبلا پتلا، بڑی بڑی آنکھیں، بکھرے ہوئے بال کچھ خوف زدہ سا شاید دنیا کے کسی تہذیب زدہ کونے سے اس طرف آنکلا تھا۔ لڑکے اس کے گرد جمع ہو گئے، تالیاں بجانے لگے وہ کچھ گھبرا سا گیا۔ اس کی

نگاہوں میں بے کسی جھلکنے لگی......"(سزا)

افسانہ نگار کی خوبی دیکھئے کہ ایک چلتا پھرتا نوجوان ہماری نگاہوں کے سامنے آجاتا ہے اور ہم اسے اپنے قریب پاتے ہیں۔ باتونی بڈھا کہانی کو مزید بڑھاتے ہوئے بیان کرتا ہے کہ وہ اس بے کس و مجبور لڑکے کو اپنے گھر لے گیا جس کا نام "عمر" تھا۔ وہ لکڑی کا کام جانتا تھا اس لئے جلد ہی اپنا گھر بھی بنالیا اور دونوں میں اتنی دوستی ہوگئی کہ اس نے اپنی دوست' نگار سے اس عمر کا تعارف کرایا اور دیکھتے ہی دیکھتے "نگار" اور "عمر" ایک دوسرے کی طرف مائل ہونے لگے اور دوریاں قربتوں میں سمٹنے لگیں۔ اس حسین پہاڑی لڑکی پر کتنے فریفتہ ہوئے اور اپنی جانیں گنوادیں۔ عمر اور نگار کا ملنا اس کے لئے ایک چیلنج بن گیا اور وہ انتقام کی آگ میں جھلسنے لگا:

> یہ میرے لئے حسد سے زیادہ تھا، انتہا سے زیادہ تھا، میں فطرت کی تمام وحشت مجھ پر حاوی ہوگئی اور میں موقعہ ڈھونڈنے لگا کہ کیوں کر انتقام لوں۔ انتقام جو موت پر ختم ہو، انتقام جو تمام لوگوں کو اپنے دامن میں لئے ہوئے ہو، انتقام جو دل کی پیاس بجھادے، مجھے اس سے نفرت ہوگئی بے انتہا نفرت، گویا وہ کوئی گھناؤنی مردار شئے تھا، حضور نفرت انسان کو اندھا کر دیتی ہے، نفرت کے پردوں میں مقابل کی اچھائیاں بھی برائیوں کا جامہ پہن لیتی ہیں، میری نگاہوں میں "عمر" برائیوں کا مجسمہ بن گیا تھا۔ خود غرض، احسان فراموش، کمینہ......"(سزا)

بڈھا اتنا جذباتی ہوگیا کہ اس کا گلا خشک ہو چکا تھا لیکن وہ یہ نہیں جانتا تھا کہ صحیح معنوں میں عمر اور نگار کے درمیان کیا رشتہ ہے۔ وہ صرف شک کی بنیاد پر یہ سوچ بیٹھا تھا۔ اس کے علاوہ وہ پہاڑی فطرت بھی شامل تھی جس کا ذکر اوپر کے اقتباس میں افسانہ نگار نے بڈھے کی زبانی کیا ہے۔ اسی درمیان اس منظر کو بھی پیش کر دیا ہے جسے ہم اور آپ وہیں جا کر حظ اٹھا سکتے ہیں۔ اردو افسانوں میں منظر نگاری کی ایسی مثال کم کم دیکھنے کو ملتی ہے۔ یہ سالک لکھنوی کے قلم کا اعزاز ہے کہ وہ ہر بار مناظر کو مختلف اور منفرد طریقے سے پیش کرتے

ہیں۔مثلاً یہ اقتباس دیکھئے:

''اچانک میری نگاہ جو اٹھی تو منظر ہی عجیب تھا۔ بادلوں کی فوجیں پہاڑوں سے ان کی چوٹیاں چھیننے کے لئے بڑھی چلی آ رہی تھیں، ہوائی قلعے تعمیر ہو رہے تھے...... کبھی کبھی چمک اٹھتی تھیں پھر جنگ شروع ہوگئی، ہواؤں کے تھپیڑوں نے طوفانوں کی شکل اختیار کر لی گویا وہ اپنے غصہ میں پہاڑوں کو جڑ سے اکھاڑ پھینکیں گے۔ خون کی جگہ پانی برس رہا تھا۔ یہ جنگ تھی بادلوں کی جنگ، پہاڑوں کی جنگ، بجلی اور طوفانوں کی جنگ، درخت اکھڑ رہے تھے، پتھر لڑھک رہے تھے۔ ذرا دیر میں کچھ نہ تھا، بادلوں نے سب کچھ فتح کر لیا، ہماری نگاہوں کے سامنے صرف ایک چادر تھی، سفید، بھوری، غلیظ چادر جو پوری کائنات پر چھا گئی تھی۔'' (ایضاً)

یہ حقیقت ہے کہ دارجلنگ کی آب و ہوا کا کوئی بھروسہ نہیں۔ کسی وقت کچھ بھی ہوسکتا ہے۔ یہ صرف آب و ہوا پر ہی منحصر نہیں بلکہ یہاں کی زندگی پر بھی یہاں کی آب و ہوا کا گہرا اثر ہے کہ کچھ ساعت پہلے جو دوست تھا، دشمن بن بیٹھا ہے۔ اس کہانی میں بھی افسانہ نگار نے اس حقیقت کو متوازن طریقے سے پیش کیا ہے۔

اس بڈھے اور عمر کے درمیان کی کشمکش کو بھی بڑی ہنرمندی سے افسانہ نگار نے پیش کیا ہے۔ دونوں میں ''لڑائی'' اس سطح تک پہنچ جاتی ہے کہ ''ڈیما'' نام کی جگہ پر دونوں لڑنے کیلئے آمادہ ہوتے ہیں لیکن عمر لڑنے سے انکار کر دیتا ہے جس کی وجہ سے اسے ''بزدل'' کہا جاتا ہے اور کسی وجہ سے ''نگار'' سے بھی الگ ہو جاتا ہے اور پھر نگار کی شادی اس بڈھے (جاوید) سے ہو جاتی ہے۔ کہانی میں واقعات کو اس حسین انداز بیان کے تحت پیش کیا گیا ہے کہ وہ تمام چیزیں ہماری آنکھوں کے سامنے رقص کرتی نظر آتی ہیں اور ہم پر محویت طاری ہوتی جاتی ہے۔

نگار اور عمر کی شادی تو نہیں ہوتی، مگر محبت ہجر کی کیفیت لئے مچلتی رہتی ہے اور عشق کی انتہا تک پہنچ جاتی ہے۔ اسی عشق نے عمر کو اپنی جانِ عزیز نگار اور اس کے شوہر کیلئے

قربان کردینے پر آمادہ کیا لیکن دوسری طرف نگار کا عاشق جو عمر تھا اس کا عشق بعد از مرگ نگار کے اعصاب پر غالب آچکا تھا یہاں تک کہ اس کے ہجر کی شکل میں اس کی موت واقع ہو جاتی ہے اور اس بہادر عمر کے قریب ہی مدفون ہوتی ہے۔

افسانہ نگار کا یہ دعویٰ غلط نہیں کہ لوگ لاشعوری طور پر اس میں اتنے محو اور جذب ہو جاتے ہیں کہ وہ کہانی کے انجام سے سسکنے لگتے ہیں۔ قاری کا سسکنا یا اس کی آنکھوں کا پرنم ہو جانا افسانے کی خوبی پر دال ہے' ساتھ ہی افسانہ نگار کے حسن بیان اور زور قلم بھی قابل داد ہے کہ وہ ماحول اور کردار کے ساتھ کتنا انصاف کرتا ہے کہ کہانی بولنے لگے۔

سالک کا ایک افسانہ ''گھر سے دور'' ہے۔ یہ افسانہ بھی دوسرے افسانوں کی طرح زندگی آموز ہے۔ اس افسانے میں دو بھائیوں کی کہانی جس میں کشمکشِ حیات بھی شامل ہے، کو اس طرح سے پیش کیا گیا ہے:

> ''دونوں دبلے پتلے تھے۔ سروں پر میلی کچیلی ٹوپیاں، پیجامہ اور قمیض پر تیل کے سیاہ دھبے، پیروں میں پھٹے پرانے جوتے، خاموش و کم گفتار، اپنے خیالوں میں گم دونوں چلتے رہے۔ راہ میں بہت کم گفتگو ہوتی کیوں کہ سون ندی کے کنارے پل سے اتر کر درختوں سے گھری ہوئی تنہائی میں ایک جگہ ایسی بھی تھی جو انہیں اپنے گھروں کی یاد دلاتی اور وہ وہیں پہونچ کر خوش ہوتے۔ یہ ان کی سیر تھی''۔ (گھر سے دور)

اوپر کی عبارت سے ان دونوں کا وضع قطع اور رکھ رکھاؤ کا پتہ چل جاتا ہے۔ وہ دونوں مل کے مزدور تھے اور دو برسوں سے گھر نہیں گئے تھے۔ حالات نے انہیں گھر چھوڑنے پر مجبور کر دیا تھا کیوں کہ فصل خراب ہونے کی وجہ سے ان میں ''لگان'' دینے کی سکت نہ تھی۔

دونوں بھائی ہر اتوار کو جنگل کی طرف نکل پڑتے اور کچھ وقت گزار کر واپس چلے آتے لیکن دوپہر کے وقت ان کی نگاہیں کسی کی منتظر رہتیں۔ پاس کے گاؤں کی ایک لڑکی ہاتھ میں پیتل کی بالٹی لئے دودھ دوہنے کے لئے وہاں آتی تھی۔ اسے دیکھ کر دونوں ایک

انجانی خوشی محسوس کرتے:

''اس کی پیتل کی بالٹی، اس کا سرخ دھاری دار لہنگا اور سبز انگیا، اس کا وہ ڈوپٹہ جسے دودھ دوہتے وقت وہ گائے کے پیچھے پیروں میں باندھ دیتی۔...........''

لڑکی جوان تھی۔ کشیدہ قامت، ابھرا ہوا گداز جسم، چہرے پر دھوپ کا اثر مگر رخسار دیہاتی آب وہوا اور محنت کی وجہ سے گلابی، گویا خون پھوٹا پڑتا تھا۔'' (گھر سے دور)

یہ لڑکی روزانہ اپنی گائے دوہنے کو اس طرف آتی تھی۔ دونوں سے شرمیلے انداز میں باتیں کرتی۔

بڑے بھائی کا نام محمد دین اور چھوٹے بھائی کا نام احمد دین تھا۔ وہ لڑکی دونوں بھائیوں کے قریب ہوتی اور گفتگو کا سلسلہ چلتا رہا۔ وہ کبھی کبھی دودھ دوہ کر پلا دیا کرتی تو ان دونوں کو بھی یہ احساس ہوا کہ وہ بھی اس کے لئے کچھ خریدے اور پیش کرے۔

دن گذرتے رہے اور دونوں کے رکھ رکھاؤ میں کچھ تبدیلیاں آنے لگیں۔ محمد دین نے اس بار اپنی تنخواہ سے دو قمیض اور دو نئے پائجامے بنوائے۔ وہ اپنے بال اب قرینے سے سنوارنے لگا، جب کہ احمد دین میں کوئی تبدیلی رونما نہیں ہوئی۔

افسانہ نگار نے کردار کے حوالے سے زبان کا بھی خیال رکھا ہے تا کہ وہ کردار اپنی اصل حالت میں نظر آئے۔ مثلاً درج ذیل جملے دیکھئے:

''اگر زمین ہوتی تو اب کی فصل اچھی ہوتی بھیا!

''کل تنھو کیا گاؤں سے آیا ہے؟'' احمد دین بولا۔

''وہ بھی یہی کہہ رہا تھا۔ اب کی پانی خوب ہوا ہے وہاں!'' (گھر سے دور)

محمد دین'' اس لڑکی کی طرف مائل ہو چکا تھا، جس کا علم احمد دین کو نہیں تھا۔ محمد دین پہلے کے مقابلے میں بدلا بدلا سا دکھائی دینے لگا۔ کئی بار وہ مل سے چھٹی لے کر غائب رہتا اور رات گئے واپس آتا۔ احمد دین کو کچھ بھی سمجھ میں نہیں آتا۔ حسب معمول دونوں بھائی اتوار کو جنگل جاتے ہیں تو دونوں کی قربت احمد دین کو یہ سوچنے پر مجبور کرتی ہے کہ اسے بھی

کچھ ہو گیا ہے، یہی وجہ ہے کہ وہ افسردہ ہو جاتا ہے اور اپنے گھر کو یاد کرتا، اپنی ماں کو یاد کرتا، جو ہر وقت اپنے بچوں کو تسکین دیتی ہے۔ گھر سے دور ماں کو قریب نہ پا کر وہ اور بھی نڈھال ہو جاتا ہے اور واپسی کے وقت سون ندی کو جھانکتا ہوا اس کی آغوش میں جا پہنچتا ہے جسے محمد دین کاش سمجھ پاتا۔

سالک کے افسانوں میں جو ڈرامائی کیفیت ملتی ہے وہ کہانی کو حقیقت سے قریب لانے میں بڑی معاون ثابت ہوتی ہے۔ خواہ وہ مکالماتی انداز بیان ہو یا الفاظ کے درو بست اور التزام نے اسے دل آویز بنا دیا ہو، یا منظر نگاری کے وسیلے سے جیتی جاگتی تصویر پیش کی گئی ہو۔ یہ سب چیزیں افسانے کو دوبالا کر دیتی ہیں جو اختتام تک قاری کو سمیٹے رکھتی ہیں۔

سالک لکھنوی کے زیادہ تر افسانے حقیقی واقعات سے آراستہ و پیراستہ ہیں۔ حقیقت کو افسانے کے قالب میں ڈھالنا کم مشکل نہیں یہی وجہ ہے کہ افسانوی لوازمات کی پاسداری اور اسے فن کے طور پر برتنے کا ہنر کم افسانہ نگاروں کے یہاں دیکھنے کو ملتا ہے۔

سالک کا ایک افسانہ ''وہ بائیس دن'' سیر و تفریح پر مبنی ہے لیکن اس میں پیش کئے گئے واقعات اپنے جذبات و احسات کی کشمکش لئے اجاگر ہوئے ہیں۔

جب افسانہ نگار کی طبیعت دارجلنگ سے اکتا گئی تو صوبہ آسام کے شہر، شیلانگ کی طرف متوجہ ہوئی۔ کوئی صاحب یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ یہ افسانہ نہیں بلکہ ایک چھوٹا سا سفر نامہ ہے لیکن ایسی بات نہیں۔ سفر نامے اور افسانے کے لوازم الگ الگ ہیں اور افسانہ نگار یہ بخوبی سمجھتا ہے کہ افسانے میں کن عناصر کو پیش کیا جانا چاہئے۔ یہ افسانہ نگار کی فنی چابکدستی پر منحصر ہے کہ وہ اپنی تخلیق کو کس حد تک شہ پارہ بناتا ہے۔ وہ شیلانگ رات میں پہنچتا ہے اور رہائش کے لے ساڑھے گیارہ بجے رات تک مارا مارا پھرتا رہا۔ بڑی مشکلوں کے بعد ایک چھوٹی سی پہاڑی پر ایک چھوٹا سا ہوٹل (گرانڈ ہوٹل) ملتا ہے۔ اس ہوٹل کا

خاکہ ان الفاظ میں پیش کیا جاتا ہے:

''پرانی کہاوت یاد آ گئی...... نام بڑا اور درشن چھوٹا!'' ہوٹل تھا صاف ستھرا...... اسی میں ایک چھوٹا سا کمرہ مجھے بھی نصیب ہوا۔ کمرے میں ایک مسہری تھی۔ ایک سنگاردان جس کے آئینہ کا ایک کونہ ٹوٹا ہوا تھا۔ بید کی گول میز تھی جس پر ایک خاندان شاید مہینوں سے پڑا تھا۔ جنوبی دروازہ کے قریب کپڑا ٹانگنے کی ایک کھونٹی تھی۔ یہ تھا فرنیچر۔ پورے ہوٹل میں ساڑھے آٹھ کمرے تھے اور ان میں چار مسافر۔ میں میرا شریک سفر، ایک بنگالی اور ایک انگلو انڈین۔'' (وہ بائیس دن)

کہانی کی شروعات یہیں سے ہوتی ہے کہ افسانہ نگار نے سنگاردان کبھی نہیں کھولا تھا، کیوں کہ اس کے استعمال کی ضرورت ہی نہیں پڑی تھی۔ ایک دن یونہی ایک دراز کھینچ لیا جس میں ایک پتلی سی میلی کاپی کے سوا کچھ بھی نہ تھا۔ اس کاپی میں کل بائیس دنوں کی روداد درج تھی۔ افسانہ نگار نے اسے بڑی خوبصورتی کے ساتھ اپنے افسانے میں پیش کیا ہے۔ وہ منظر کشی کرتے ہوئے گاڑی کی رفتار کا بھی خیال رکھتا ہے اور اس میں سوار لوگوں کی ذہنی کیفیات کو بھی بیان کرتا جاتا ہے۔ گاڑی کی اندرونی حالت اور گاڑی کے بیرونی نظاروں سے لطف اندوزی بھی ملتی ہے۔ سماجی و مذہبی حقیقت کو بھی جملوں میں قید کر دیا جاتا ہے۔ یہ جملے:

''پجاری پہلے پیسے لیتے ہیں پھر مندر اور مورتیں دکھاتے ہیں...... جادو کہیں نظر نہیں آیا...... یہاں کی لڑکیوں کی آنکھیں بڑی خوبصورت ہیں۔ بڑی بڑی، سیاہی مائل، نمناک سی، گویا قدرت نے محبت کوٹ کوٹ کر بھر دی ہے۔ کیا یہی جادو تو نہیں جس کا اتنا چرچا ہے؟ نظارہ دلچسپ تھا اور دامن افق سے متصل بادلوں کے سایہ میں دریائے برہم پترا ابل کھا رہا تھا''۔ (وہ بائیس دن)

کہانی یہاں مزید خوبصورت اور دلچسپ معلوم ہونے لگتی ہے۔ کیونکہ افسانہ نگار آبشاروں کے درمیان سے گذر رہا تھا اور قدرت کے حسین جلووں سے اپنے دل و دماغ کی تطہیر کر رہا تھا۔ ساتھ ہی حسین و جمیل دوشیزاؤں کا ساتھ ایک الگ لذتیت فراہم کر رہا تھا۔

زندگی اور موت کا نظارہ پہلو بدلتے ہی دیکھنے کو مل سکتا تھا۔ افسانہ نگار ان لڑکیوں کے درمیان سیر وتفریح کا مزہ لے رہا ہے اور عشق ومحبت کی فطرت سے بھی آگاہ ہے۔ اس لئے وہ یہ بھی کہتا ہے کہ:

''کتنی دلکش، کتنی فرحت بخش ہے وہ چیز کہ کسی حسین لڑکی سے ساتھ چائے پی رہے ہوں اور اسی ریسٹوران میں دوسروں کی نگاہیں رہ رہ کر اٹھ رہی ہوں اور لڑکی سے زیادہ اس مرد پر پڑ رہی ہوں جس کے ساتھ دو لڑکیاں ہوں۔ دنیا کی حاسدانہ نگاہوں میں کسی نوجواں کا رتبہ بڑھانے کے لئے اس سے عمدہ ترکیب اس سے بہتر چیز کوئی اور نہیں۔

تمام خوشیوں، تمام عشرتوں میں عورت کامیاب ترین، نایاب ترین شے ہے۔ جس کی سب سے زیادہ قیمت ادا کی جاتی ہے کیوں کہ سب سے زیادہ اسی کی مانگ ہے۔ لہٰذا یہی ایک شئے ہے جو اس قابل ہے کہ اس کا مالک اپنی ملکیت کی نمائش کرے۔ دوسروں کو ترسائے، خود خوش ہو......اور ایسا ہوتا ہے ایسا کیا جاتا ہے......میں بہت خوش ہوں''۔
(وہ بائیس دن)

ان خوبصورت مناظر کے ساتھ اگر خوبصورتی ساتھ ہو تو یہ دو آتشہ بن کر لوگوں کو مسحور کر جاتی ہے۔ افسانہ نگار بھی اس کے حسن کی جلوہ سامانیوں کی تاب نہ لا سکا اور اس کے جذبات برانگیختہ ہو گئے:

''جذبہ کے ماتحت میں نے مکھن لگا ہوئی روٹی کا ایک ٹکڑا اپنے ہاتھ سے اسے کھلا دیا۔ اس کا چہرہ کسی کیفیت کا آئینہ دار تھا، شاید میرا بھی۔ وہ کسی آنے والے لمحے کے انتظار میں تھی، شاید میں بھی تھا۔ پھر نہیں معلوم کیوں اور کیوں کر اور کس طرح میرے بازوؤں نے اسے اپنی گرفت میں پایا اور میرے ہونٹوں نے اس کے ہونٹوں کو_____ زندگی کا پہلا موقعہ تھا۔ میرے ہونٹ دیر تک کپکپاتے رہے۔'' (وہ بائیس دن)

زندگی کی ناتجربہ کاری انسان کو ایک دن تجربہ کار بنا دیتی ہے۔ یہاں بھی کچھ ایسا ہی معاملہ نظر آتا ہے۔ اپنے کئے پر وہ نادم ہے اور اسے ''تاریک ترین گناہ!'' سمجھتا ہے۔ اسے اپنے کنوارے پن ختم ہونے کا ملال ہے اور جسے شرم سے تعبیر کر رہا ہے۔ اس کے دو

دنوں کے بعد کی کیفیت افسانہ نگار نے کچھ یوں پیش کی ہے:

''18 مئی ــــ کچھ تمنائیں کچھ خوابیدہ آرزوئیں جاگ اٹھی ہیں۔غور کر رہا ہوں۔ سمجھتا ہوں پھر بھی کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔یعنی سمجھ کر بھی نہیں سمجھ سکتا۔دل نہیں مانتا۔بہلنا نہیں چاہتا، یہ سب آخر کس لئے؟ جو تجھے بھول گیا ہے۔تو اسے بھول جا۔یہ تڑپ، یہ بے چینی، یہ بے کلی کس کے لئے؟ جس کی امید ہو اس کی آرزو بے کار، جستجو بیکار، دل سے کہہ کہ اپنے آپ سے محبت کر، اپنے وجود سے محبت کر، یہی معراج محبت ہے۔'' (وہ بیس دن)

اس افسانے میں صرف سیر و تفریح نہیں بلکہ محبت کی معراج بھی شامل ہے' منظر نگاری کا کمال بھی ہے اور زندگی و موت کا فلسفہ بھی۔زندگی اور آرزوؤں کی جستجو بھی شامل ہے اور فطرت انسانی کی خو بھی۔

افسانہ نگار نے اور افسانوں کی طرح یہاں بھی مکالماتی انداز بیان اختیار کیا ہے جس میں فکر کی لہریں موجزن ہیں۔مثلاً:

''اے حسن کی دیوی! میں اس دنیا میں جا رہا ہوں جس نے ذرا سے بہانہ پر میرے ارمان چھین لئے۔جہاں محبت جرم ہے، گناہ ہے جہاں مطلب پرست آباد ہیں اور تمناؤں کو کچل ڈالتے ہیں...... مگر میں پھر آؤں گا، جلد آؤں گا۔تم بھی تنہا ہو، میں بھی تنہا ہوں، تنہا ہی رہوں گا۔اب جب آؤں گا تو تنہا نہ ہوں گا۔اپنے وسیع دامن میں دو گز زمین مجھے بھی دے دینا۔شاید تمہاری خاموش لوریوں میں نیند آجائے تو سو رہوں گا...... الوداع، الوداع!'' (ایضاً)

اب ان جملوں کو دیکھئے اور سالک کے اسلوب بیان کی ندرت پر عش عش کر اٹھئے:

دل بے تاب! ٹھہر! کیا ڈھونڈ رہا ہے؟ سکون؟ یکسوئی............ یہاں نہیں ملے گی۔ اس گھر میں نہیں، اس دنیا میں نہیں۔چل، وہیں چل...... بادلوں کی دنیا میں...... وہاں تسکین ملے گی، تنہائی ملے گی، سکون ملے گا!...... چھوڑ اس دنیا کو، چھوڑ اس دنیا کے دھن، یہاں حیات اور اس کے بعد محبت! محبت!!

اور اگر مر گیا تو؟...... ماں دیوانی ہو جائے گی۔ باپ کو غم ہوگا کہ ایک مددگار چل بسا۔
دوست کہیں گے۔ وہ پاگل فلسفی؟ کتنا عجیب تھا وہ!'' (ایضاً)

مختصر یہ کہ افسانہ نگار نے اپنے محسوسات کو اس خوبصورتی کے ساتھ پیش کیا ہے کہ نثر میں آہنگ اور نغمگی پیدا ہوگئی جسے ہم ایک بڑی خوبی سے تعبیر کر سکتے ہیں تا کہ قاری ابتدا سے ہی دلچسپی لینے لگے اور کلائمکس پر پہنچ کر ہی دم لے۔ وجہ صاف ہے کہ افسانہ نگار خود بھی ایک باکمال شاعر ہے' اس لئے الفاظ کے برمحل استعمال اور ان کی معنیاتی تہہ داری سے پوری طرح آشنا ہے۔ ساتھ ہی زبان و بیان کے خوبصورت رچاؤ نے اس افسانے کو معراج کمال تک پہنچا دیا ہے۔

افسانہ نگار کی ایک خوبی یہ بھی ہے کہ وہ افسانے کا آغاز اچانک کر دے اور سسپنس پیدا کر دے۔ افسانہ ڈاکٹر میں ایسا ہی انداز بیان سالک لکھنوی نے اپنایا ہے۔ افسانے کا آغاز یوں ہوتا ہے:

''اس کے منہ سے ایک دبی ہوئی چیخ نکل گئی۔

''کیا ہے؟'' عرفانی نے اپنی گرفت ڈھیلی کرتے ہوئے پوچھا۔

''کس نے دروازہ ہلایا۔'' سائرہ نے آنچل درست کرتے ہوئے سانس روک کر کہا۔

''ہش! صرف وہم ہے تمہارا......''

''مجھے یقین ہے کہ......''

''کیا............؟''

''ڈاکٹر احمد شکیل!'' سائرہ نے جواب دیا۔

''اس کے آنے کا یہ وقت نہیں ہے۔'' عرفانی نے یقین دلاتے ہوئے کہا...... ''اس کا یہ وقت نہیں۔ وہ حسب معمول اس وقت اپنے معمل میں ہوگا۔ اور مان لو اگر وہی تھا تو پھر کیا تم اپنا کمرہ بند کر کے سو رہی تھیں!''

''لیکن تم اپنی ہیٹ جو باہر کھونٹی پر ٹانگ آئے!''

''اس کا کون خیال کرتا ہے، فضول خود کو پریشان نہ کرو۔ نہیں جانتی میں اس کا افسر ہوں!''

اور پھر دونوں ایک دوسرے کی نیم عریاں آغوش میں پہونچ گئے۔'' (ڈاکٹر)

آپ نے دیکھا کہ افسانے کا آغاز کس ڈرامائی انداز میں ہوا جس میں تجسس کی زیریں لہریں موجود ہیں۔ یہیں سے قاری کا اشتیاق بڑھنے لگتا ہے اور مزے لیتا ہوا افسانے کی تہہ تک پہنچنے لگتا ہے۔ یہ اشتیاق اسے افسانے کے آخری پڑاؤ تک بڑی سبک روی کے ساتھ لے جاتا ہے۔ کیونکہ آغاز سے کہانی کے پلاٹ کا قدرے اندازہ تو لگایا جاسکتا ہے مگر اس کی اصل تک رسائی آخری جملے تک پہنچے بغیر ممکن نہیں۔

کہانی کچھ وقفے کے لئے پس منظر میں چلی جاتی ہے۔ سائرہ اور احمد شکیل کے درمیان وہ کون سی کمی ہے جو ایک دوسرے کو دور کرتی ہے۔ سائرہ آخر کیوں کسی دوسرے کی قربت چاہتی ہے۔ اصل میں سائرہ اس زمانے کی گریجویٹ لڑکی ہے جس کی تمنائیں آسمان کو چھوتی ہیں۔ چھوٹی بہنیں اپنے اپنے گھروں میں خوش ہیں لیکن سائرہ کی تمنا ''انگلینڈ ریٹرنڈ'' کی تھی، مگر ڈاکٹر شکیل سے اس کی شادی ہوگئی جس میں خود سائرہ کی مرضی بھی شامل تھی۔ مگر وہ چیز جو انسان کے دل میں پہلے سے ہوتی ہے، نارسائی کی شکل میں دل کے کسی خانے میں کسمساتی رہتی ہے اور جب موقع ملتا ہے یہ آشیانے سے نکل پڑتی ہے۔ حسن کا شیدائی کہاں نہیں لیکن اس کی جلوہ سامانیاں انسان کو عموماً گمراہ ہی کرتی ہیں۔

اس کہانی میں سماجی ناہمواریوں کو موضوع بنایا گیا ہے۔ افسانہ نگار عرفانی کا تعارف اس طرح کراتا ہے کہ اس کا خاکہ ہی سب کچھ بتا دیتا ہے۔ مثلاً:

''عرفانی ایک اچھا شکاری تھا اور ہر ایک سے بہت جلد بے تکلف ہو جانا اس کی خصوصیت تھی۔ سڈول جسم، چمکیلی اور عمیق نگاہوں اور ایک دلکش مسکراہٹ کا مالک تھا۔ عمر چالیس کے لگ بھگ تھی مگر اس صحت تیس (30) سے زیادہ کہنے کی اجازت نہیں دیتی تھی۔ فطرت کا محتاط، زندہ دل، شوقین طبیعت، ''لیکن ــــــ'' (ایضاً)

افسانہ نگار نے جہاں عرفانی کی تعریف کی ہے وہاں ''لیکن'' لکھ کر قاری کے تجسس کو بڑھا دیا ہے جو افسانے کا حسن بھی ہے۔

جب عرفانی، شکیل کی دعوت پر گھر آتا ہے تو اس وقت اس وجیہہ شخص کو دیکھ کر اس کے ادھورے ارمانوں کے سنورنے کا احتمال ہونے لگتا ہے۔ یہ اسی وقت ہوتا ہے جب عورت اپنے شوہر کو سمجھ نہیں پاتی کہ وہ بھی کتنا پیار اس سے کرتا ہے۔ صرف ظاہری تعریف ہی محبت نہیں ہوتی بلکہ محبت تو دل کی دھڑکن کا نام ہے اور جب معاملہ ازدواجی زندگی کا ہو تو یہ زن وشو کے رگ وپے میں سرایت کر جاتی ہے اور ایک جان دو قالب کی مثال بن جاتی ہے۔ ڈاکٹر شکیل ایک خاموش طبع انسان واقع ہوا تھا۔ وہ تصنع سے دور تھا لیکن اس کی بیوی اس کے برعکس تھی۔ وہ رنگین خوابوں کی تعبیر چاہتی تھی اور نامکمل آرزوؤں کی تکمیل بھی۔ بقول افسانہ نگار:

> ''اس کے رنگین خواب رنگین تر تعبیر چاہتے تھے۔ اس کی بے چین آرزوئیں طوفان بدوش آرزوؤں سے ملنا چاہتی تھیں۔'' (ڈاکٹر)

اس افسانے میں جدید سماج کی عکاسی بھی ملتی ہے۔ انسان کی خواہشیں بے شمار ہیں، ہر خواہش کی تکمیل ممکن نہیں۔ کچھ خواہشیں باقی رہنی چاہئیں کہ انسان میں زندگی کی رمق باقی رہے۔

سائرہ اصل میں طلاق چاہنے لگی تھی عرفانی کی چاہ میں۔ لیکن شکیل چوں کہ زمانہ شناس تھا اس لئے اس نے ''نکھار'' جانے کے وقت ہی کہہ دیا تھا کہ وہ اسے طلاق دے سکتا ہے اگر عرفانی اس سے شادی کر لے۔ وہ خوش ہوتی ہے مگر جب حقیقت سامنے آتی ہے تو عرفانی پیچھے ہٹ جاتا ہے اور سائرہ کو ساری بات سمجھ میں آجاتی ہے کہ لوگ صرف جنسی تلذذ کے لئے دوسرے کو پھانستے ہیں، شیخیاں بگھارتے ہیں جبکہ عملی زندگی میں صفر ہوتے ہیں:

> ''آخر وہ مجھے ہمیشہ کے لئے چھوڑ دینے پر تیار ہو گیا ہے۔ لیکن ایک شرط پر......''

سائرہ نے جلد، جلد سب باتیں عرفانی سے کہہ ڈالیں۔

''ایک شرط پر! خوب! کون سی شرط ہے وہ؟

''تم وعدہ کرو کہ شرط پوری کرو گے''۔

''تم کہو تو!''

''تم مجھ سے نکاح کرلو!''

عرفانی سناٹے میں آگیا۔ اسے یہ امید نہ تھی کہ بات یہاں تک پہونچ جائے گی۔ وہ اس قسم کے کھیل کھیلنے کا عادی تھا مگر کسی کھلونے کا پابند ہونا نہیں چاہتا تھا.............

سائرہ کچھ نہ سمجھ سکی۔

''کیا کہہ رہے ہو تم؟ بس یہی موقعہ ہے کہ ہم دونوں آسانی سے ایک دوسرے کے ہوسکتے ہیں۔

''بڑی مشکل ہے۔'' عرفانی نے اپنے چہرے پر پریشانیاں ظاہر کرتے ہوئے کہا۔'' (ایضاً)

افسانہ نگار نے سماج اور اس میں بسنے والے انسانوں کے نقاب کو بھی اتار پھینکنے کی کوشش کی ہے، تاکہ اپنا احتساب کر سکیں۔ کہانی کا انجام یہاں نہیں ہوتا بلکہ ''مکھار'' جہاں موت قدم قدم پر استقبال کر رہی ہے۔

یہاں ڈاکٹر شکیل انچارج تھا۔ ہر طرف سے اس کی واہ واہی نے سائرہ کے دل میں شکیل کیلئے پیار پیدا کر دیا تھا لیکن اس کے بطن میں پلنے والا کسی اور کی امانت بن کر آنے والا تھا۔ شکیل کی حالت اتنی بگڑ گئی کہ وہ اسے پیار کرتے ہوئے اس جہانِ فانی سے کوچ کر گیا۔ سائرہ اپنے کئے پر نادم تھی لیکن اب بہت دیر ہو چکی تھی۔

ان تمام افسانوں کے مطالعے سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ افسانہ نگار نے افسانے کی باریکیوں اور فنی لوازمات کو بہتر طریقے سے پیش کیا ہے۔ اس کامیابی کے پیچھے سالک صاحب کا اپنا اسلوبِ بیان اور ندرتِ فکر ہے۔ ساتھ ہی ڈرامائی اندازِ بیان نے افسانے میں جان ڈال دی ہے اور قاری پر ان کی گرفت کبھی ڈھیلی نہیں ہونے پائی ہے۔

اس کتاب میں کل آٹھ افسانے ہیں جو اپنی مثال آپ ہیں اور دعوتِ فکر دیتے ہیں۔ یہ افسانے ان معنوں میں اہم ہیں کہ یہ آزادی ہند سے قبل لکھے گئے ہیں اور سماجی موضوعات کا احاطہ کرتے ہیں۔اس لئے ان افسانوں کواس زمانے کے تناظر میں دیکھنے کی ضرورت ہے تا کہ ان کی اہمیت واضح ہو سکے۔

میں نے سالک صاحب کے افسانوں کا ایک تعارف پیش کیا ہے، باقی کام قاری اور اہل نظر پر چھوڑ دیا ہے کہ وہ ان افسانوں کو آزادی ہند کے پہلے کے افسانہ نگاروں کے افسانوں سے تقابل کریں اور ان کا ایک معیار قائم کریں۔

اس کتاب کی اشاعت کے سلسلے میں بڑی دشواریاں حائل رہیں۔ پہلی دشواری صدر شعبۂ اردو، داجلنگ گورنمنٹ کالج، دارجلنگ ہونے کی شکل میں ہوئی کیوں کہ اردو کتابوں کی طباعت یہاں نہیں ہوتی۔اس کام کے لئے بار بار کلکتے آنا بہت مشکل تھا۔دوسری دشواری سالک صاحب کے ان افسانوں کی تلاش اور انہیں نقل کرنے کی پیش آئی۔

پروفیسر قمر رئیس صاحب نے بلا کسی تامل کے اس کتاب کا ''پیش لفظ'' تحریر فرمایا جس کیلئے ان کا تہہ دل سے شکر گزار ہوں۔اساتذۂ کرام میں پروفیسر شارب ردولوی، پروفیسر صدیق الرحمٰن قدوائی، پروفیسر اسلم پرویز، پروفیسر محمد شاہد حسین، پروفیسر یوسف تقی، پروفیسر محمد منصور عالم، پروفیسر تنویر احمد، پروفیسر انیس اختر اور پروفیسر غلام سرور صاحبان کا بھی ممنون ہوں جنھوں نے ہمیشہ میری ذہنی وفکری آبیاری کی۔اپنے والد بازغ بہاری صاحب کے لئے شکریے کا لفظ بے معنی لگتا ہے جنہوں نے قدم قدم پر مجھے حوصلہ دیا ہے۔ بڑے بھائی ڈاکٹر سنجر ہلال بھارتی نے اپنی مصروفیات سے وقت نکال کر کتابت سے طباعت تک کے مرحلے اکیلے طے کیے،ان کی محبتوں کے آگے میرا سر خم ہے!

عمر غزالی

اچھوت ____ !

وہ دونوں چمار تھے اور جوتے ٹانکا کرتے تھے۔

چمار ____ نیک چل، ملنسار اور میٹھی زبان رکھتا تھا۔

اس کی بیوی چمارن بڑی ہنس مکھ اور رحمدل تھی۔ گھر کے کام دھندوں کے بعد وہ بھی اپنے سوامی کے جوتے ٹانکا کرتی ____ دونوں کی آنکھوں کا تارہ، دونوں کی آشاؤں کی دنیا، ایک چھوٹی سی لڑکی تھی جو صحن میں کھیلا کرتی۔

کتنے ہی گاؤں اُجڑ گئے تھے ____ چاروں طرف وبا پھیلی ہوئی تھی۔ چمارن نے اپنی ساری دولت اپنے سوامی پر نثار کر دی ____ مگر موت کا دیوراضی نہ ہوا۔ چمارن بیوہ ہوگئی۔

ماں کو روتا دیکھ کر پانچ برس کی چھوٹی بچی پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

سات برس بیت گئے ____ اب لڑکی بارہ برس کی تھی۔ گاؤں کی آبادی بڑھ گئی۔ موت کے دیوتا کو غصہ آ گیا۔ چتائیں روشن ہوگئیں اور گورستان آباد ____ چمارن کو بھی دورہ پڑا اور وہ بیمار ہوگئی۔

لڑکی دوڑی دوڑی گاؤں کے 'وید' کے پاس گئی۔ بڑی خوشامد کی، ہاتھ جوڑے، ناک رگڑی، آنسو بہائے مگر پنڈت جی کے دھرم نے اجازت نہ دی۔ وہ اچھوت کے گھر کیسے جاتے؟ دھرم نشٹ نہ ہو جاتا ____؟

نادان لڑکی ''ایشور'' کو بُرا بھلا کہنے لگی۔ کیا اچھوت آدمی نہیں ہوتے؟ وہ روتی

ہوئی گھر واپس ہوئی۔ ماں اپنے سوامی کے پاس جانے کی تیاری کر رہی تھی ـــــ لڑکی نے پانی مانگا۔ گھر میں پانی نہ تھا۔ اس نے گھڑا اٹھایا اور کنویں کی طرف چلی۔ برہمن مہاشے کھڑے نہا رہے تھے۔ اس نے گھڑا آگے بڑھا دیا اور تھوڑا سا پانی مانگا۔ اس کی ماں مر رہی تھی، برہمن مہاشے کی آنکھیں لال ہوگئیں۔ ایک اچھوت لڑکی کو وہ اپنے ہاتھ سے پانی کیونکر دیتے؟

کنواں ان کے لئے تھا یا اچھوتوں کے لئے ـــــ؟

''چل دور ہو ـــــ!'' انہوں نے ڈانٹ پلائی۔ ''بے حیا چھوکری''

ماں نے اپنی آنکھیں ہمیشہ کے لئے بند کرلیں۔ اب اس سنسار میں لڑکی کا کوئی نہ تھا۔ وہ بلک بلک کر رونے لگی۔ کون تھا جو اسے تسلی دیتا؟ ـــــ در و دیوار، پیڑ پتیاں، سب خاموش!

''وید مہراج'' کے یہاں بیٹا پیدا ہوا۔ بڑے بڑے لوگوں کو دعوت دی گئی۔ برہمن مہاشے بھی آئے۔ وہ سب کے پاس بیٹھی تھی۔ اس کو بہت عمدہ ناچنا آتا تھا، اور گانا بھی ـــــ اس کی بڑی آؤ بھگت ہوئی، پان پر پان ملنے لگے۔ پیاس لگنے پر برہمن مہاشے نے پانی بھی پلایا۔ یہ تھی وہی اچھوت چمارن کی لڑکی ـــــ! ایک نوجوان اسے گھور گھور کر دیکھ رہا تھا۔

وہ دونوں ایک ساتھ بیٹھے ہوئے تھے۔

''میں نے کل تمہیں دیکھا تھا، محفل میں ـــــ تم میری ہو جاؤ!''

''میں تمہاری نہیں ہوسکتی ـــــ میں اچھوت ہوں، ایک فاحشہ چمارن، تم شریف ہو، شریف کے لڑکے ہو ـــــ میں نیچ ہوں، تم اونچ ہو ـــــ میں تمہاری نہیں ہوسکتی، تم برادری میں ذلیل ہو جاؤ گے ـــــ بدنام ہو جائے گے ـــــ!''

''آکاش کے نیچے سب برابر ہیں۔کوئی چھوٹا بڑا نہیں۔ میں تمہارا ہوں، تم میری ہو جاؤ!''

باغ میں ایک ہی بنچ پر دونوں بیٹھے تھے۔ مسکراہٹ ان کے چہروں پر کھیل رہی تھی۔ ''برادری ظالم ہے، وہ صرف اپنا بھلا دیکھتی ہے اور اپنے مطلب کے قانون بناتی ہے۔ پہلے پہل برادری نے کتنا غل مچایا تھا مگر پھر آپ ہی آپ چپ ہوگئی۔ اب ہم دونوں کو کوئی جدا نہیں کرسکتا...... دنیا اس کی ہے جو اس کے خلاف ہو۔ میں تمہارا ہوں!''

☆☆☆

مطبوعہ رسالہ ''آئینہ'' 1934ء
مدیر: اسحاق امرت سری

فارانی ـــــــــ !

زندگی کتنی عجیب ہے، یہ خیال اکثر مجھے سب کچھ بھول جانے پر مجبور کر دیتا ہے۔ اور پھر جب میں غور کرتا ہوں کہ زندگی میں سب سے زیادہ عجیب چیز کیا ہے، تو اس نتیجہ پر پہونچتا ہوں کہ انسانی زندگی کی عجیب ترین چیز انسانی کمزوری ہے! ممکن ہے آپ میرے خیال سے متفق نہ ہوں، لیکن ذیل کی فسانہ نما حقیقت اس بات کی آئینہ دار ہے کہ ایک 'خاص کمزوری' نے ایک مرد اور ایک عورت کی زندگی کس طرح تباہ کر دی ـــــ میرے نظریے میں محبت دلی کمزوری کا دوسرا نام ہے!

---

(۱)

اس کی شادی ہوگئی ـــــ کیپٹن فارانی سے!

اور اس نے اپنے ضمیر کی آواز کے خلاف اس رشتہ کو قبول کرلیا، قبول کرلیا زمانۂ گذشتہ کی رنگین مگر دھندلی تصاویر کی جانب سے آنکھیں بند کرتے ہوئے۔ مگر وہ مجبور تھی کیوں کہ عورت تھی، عورت کا دل لے کر آئی تھی اور عورت کی تمنائیں بھی۔ کہتے ہیں کہ عورت مرد کی آغوش میں آکر ہر شئے کو بھول جاتی ہے، اسے کچھ یاد نہیں رہتا سوائے اس کے کہ اسے کسی رنگین خواب کی تعبیر مل رہی ہے، جو خواب سے زیادہ رنگین ہے! ـــــ عذرا بھی کیپٹن فارانی کے کشادہ بازوؤں میں اپنے گھٹتے ہوئے ارمانوں کو سونپ کر ایک عرصہ کیلئے سب کچھ بھول چکی تھی۔ وہ اپنی رنگین خواہشوں اور دبے ہوئے ارمانوں کی کیفیتوں میں کھو کر ماضی قریب کی ہر چیز اپنے دل سے محو کر چکی تھی، اور جذبات کی اس کشمکش میں وہ ریاض کو بھی یاد نہ رکھ سکی۔

ریاض اس کا رشتے میں بھائی تھا، ہم عمر تھا۔ دونوں ساتھ کھیلے تھے، ساتھ پڑھے

تھے اور جوانی کی بھیانک وادیوں میں دونوں نے ساتھ ہی قدم بھی رکھا تھا۔ پھر اس میں تعجب ہی کی کیا بات تھی جو ریاض کی نگاہیں عذرا کے لئے وہ نہ رہی تھیں جو پہلے تھیں اور جن کی چمک بجائے سطحی ہونے کے زیادہ عمیق ہو چلی تھی۔ محبت کتنی ہی عجیب کیوں نہ ہو اور شاعر و نقاد اس کی کتنی ہی قسمیں کیوں نہ کر دیں لیکن جس جذبے کے ماتحت یہ بیماری شروع ہوتی ہے وہ اتنا عام ہے کہ کسی مزید تشریح کی ضرورت نہیں ــــــ تنہائی کا خیال، حسن کی کشش، موسم کا اثر، پر کیف ہوائیں اور خدا معلوم کیا کیا نظریے ہیں جن سے محبت کا تعلق ظاہر کیا جاتا ہے۔ لیکن میں تو صرف یہ سمجھ سکا کہ شباب و جوانی کے جذبات جو اندھے ہوتے ہوئے اور شاید بہرے بھی، اپنی اندرونی کمی کو پورا کرنا چاہتے ہیں۔ اور شاید یہی وجہ ہے کہ عورت یا مرد جب کسی ایک سے ملتفت ہو کر اپنی محبت کا جواب نہیں پاتے تو کسی اور طرف متوجہ ہو جاتے ہیں، جام پر جام چڑھاتے ہیں، یہاں تک کہ ان کی پیاس بجھ جاتی ہے، ان کے دل بھر جاتے ہیں اور جذبات مطمئن ــــــ لیکن یہ نظریہ کلیہ نہیں، بارہا ایسا بھی ہوا کہ کسی نے محبت کی اور تادم مرگ اس پر قائم رہا۔ اس سے بے نیاز کہ کوئی اس کی بے لوث محبت کا جواب دے۔ میرے خیال میں یہ بیماری کی وہ حالت ہے جس میں علاج کارگر نہیں ہوتا!

ریاض کی نگاہیں محبت سے معمور ہوتی گئیں، اور عذرا نے ایک فاتحانہ تبسم کے ساتھ ان نگاہوں کو قبول کر لیا اور وہ نگاہیں عذرا کو بھلی کیوں نہ معلوم ہوتیں؟ ــــــ ایک جوان لڑکی کی سب سے پہلی تمنا یہ ہوتی ہے کہ کوئی اس سے محبت کرے۔ ریاض پر بھی یہ ظاہر کر دیا گیا کہ اس کی محبت کامیاب ہے۔ اب اگر اس نے ڈرتے ڈرتے بھی کسی تمنا کو پرورش کرنے کی کوشش کی تھی تو اس آگہی نے اسے سرتاپا ارمان بنا ڈالا۔ لیکن تعجب تو یہ تھا کہ اس خاموش پیمان محبت کے باوجود ریاض کو ٹھکرا کر عذرا ہمیشہ کے لئے ایک اجنبی کی کیوں کر ہو گئی ــــــ؟

وجہ شاید یہ ہو ــــــ ریاض کے لئے محبت کا مفہوم صرف محبت کرنا تھا۔ فلسفے کی

خشک کتابوں اور موجودہ افسانہ نگاروں، ناول نویسوں سے محبت کے بارے میں جو سبق اسے ملا تھا وہ یہ تھا کہ بس محبت کئے جاؤ، پاک اور بے لوث محبت! ان غیر فطری فسانوں کو پڑھ کر ایسے اپنے سینے میں مچلتے ہوئے جذبات گھناؤنے معلوم ہوتے تھے، وہ عذرا کو قریب پاتا مگر اسے چھونے کی ہمت نہ کرسکتا تھا۔ بچپن کی بیبا کی ختم ہوچکی تھی اور اس کی جگہ ایک عجیب شرم نے لے لی تھی۔ وہ چاہتا تھا کہ عذرا اس کے قریب بیٹھے مگر وہ اس سے اپنی یہ خواہش ظاہر نہیں کرسکتا تھا۔ وہ اپنے جذبوں سے شرماتا تھا، وہ اس سے ناواقف تھا کہ اس کی یہ روش خلاف فطرت ہے اور شباب کے لئے جرم!

پھر اسے ایک اور تدبیر سوجھی جس میں اسے کامیابی کی پوری امید تھی، کسی کے ذریعہ شادی کا پیغام! اور جواب میں اس نے سنا کہ ابھی اس کی تعلیمی زندگی ختم نہیں ہوئی ہے، پھر دیکھا جائے گا۔

عذرا کو اس سے محبت تھی، لیکن وہ ریاض کی طرح محبت کی بے ستون روحانی بلندیوں کی خواہش مند نہ تھی۔ وہ دنیا کی رنگینیاں دیکھ رہی تھی، دنیا کو رنگین سمجھ رہی تھی اور محبت کے رنگین پردوں میں اپنے رنگین جذبات کی تسکین چاہتی تھی۔ اس کا انتظار صحیح معنوں میں ایک عورت کا انتظار تھا اور آخر —

”شباب آہ کہاں تک امیدوار رہے
وہ عیش عیش نہیں جس کا انتظار رہے!“
(اقبالؔ)

(۲)

ریاض کی سکونت کلکتہ میں تھی کیونکہ یہیں اس کے والد کا وسیع کاروبار تھا اور یہیں اس کی تعلیمی زندگی ختم ہونا تھی۔ لیکن وہ اکثر لکھنؤ جاتا۔ چنانچہ اس بار بھی ہمیشہ کی طرح وہ دو ہفتے لکھنؤ رہ کر کلکتہ واپس آگیا ــــــ یہ دو ہفتے اس کیلئے بہت دل کش تھے اور رعنائیوں

سے معمور۔ کیونکہ وہ ان دو ہفتوں میں عذرا کے قریب رہا تھا اور آئندہ کے لئے کئی امیدیں بسائی تھیں!

اس نے کتابوں میں پڑھا تھا۔ محبت میں اثر ہوتا ہے، محبت بے غرض ہونا چاہئے، محبت کا اظہار اس کی توہین ہے، محبت میں فنا ہونا زندگی پانا ہے! اور وہ اپنی زندگی کے ڈرامے میں انہیں اوصاف کا ہیرو ہونا چاہتا تھا۔ وہ محبت کی خاموش پرورش کر رہا تھا کہ اس میں اثر ہوتا ہے، اس نے عذرا کی تمنا کو دل سے دور رکھنے کی کوشش کی کہ محبت بے غرض ہونا چاہئے۔ اس نے دلی کرب کے باوجود عذرا سے ایک لفظ نہ کہا ورنہ یہ محبت کی توہین ہوتی اور اس نے محبت میں فنا ہونے کی دعائیں مانگیں کہ اس میں حیات تھی، ابدی، زندگی بھی غیر فانی۔! لیکن ان حماقتوں کے باوجود آخر کار —

(۳)

فروری کی چار پانچ تاریخ تھی۔ ریاض کو لکھنؤ سے آئے ہوئے چار ماہ گذر چکے تھے۔ موسم کلکتہ کی بہار سے اچھا تھا اور جذبات آفریں بھی۔ ایک بجا ہوگا کہ ریاض اپنی مختصر سی لائبریری میں آیا۔ بلا ارادہ ایک کتاب اٹھالی اور پڑھنے لگا، یہ تھی ''حیات جاوداں''

''قدر اس کی ہوتی ہے جو بعد محنت حاصل ہو اور جو اور کافی انتظار کے ملے......''

''اچھی بات ہے'' اس نے سوچا ــــــ ''اچھی بات ہے جو میں ابھی عذرا کو حاصل نہ کرسکا، شاید میں اس کی اتنی قدر نہ کرسکتا جتنی یہ وہ امتحان پاس کرنے کے بعد کرسکوں گا۔ قدر اسی کی ہوتی ہے جو بعد کافی انتظار کے ملے، یہی مطلب ہے نا؟ اور میں تو سراپا انتظار ہو گیا ہوں!''

اس نے کتاب بند کردی اور کسی خیال میں گم ہوگیا۔ اس کی نگاہوں میں ایک حسین صورت پھرنے لگی۔ وہ بیٹھے بیٹھے خواب دیکھنے لگا۔ پھر وہ یکا یک چونک پڑا، اسے کسی کی چاپ سنائی دی:

''آپ کو بیگم صاحب بلا رہی ہیں!'' ایک نوکر نے آ کر کہا، اور ریاض فوراً اپنی ماں کے پاس پہونچ گیا۔

''دیکھا بھیا! اسی کو عزیز داری کہتے ہیں!'' ریاض کی ماں نے اسے دیکھتے ہی کہا۔ وہ سمجھ گیا کہ کوئی غیر معمولی بات ہوئی ہے۔ ''کیا ہوا اماں؟'' اس نے پوچھا۔

''اپنوں سے تو غیر ہی اچھے۔'' ماں نے اپنی تقریر جاری رکھی۔ ''کہ بیاہ شادی، تیج تہوار میں تو یاد کر لیتے ہیں!''

''لیکن ہوا کیا اماں؟'' ریاض نے پھر پوچھا۔

''ہوا کیا۔ ہوا یہی کہ تمہاری خالہ نے اپنے گھر میں شادی چھیڑی اور دو بول بلاوے کے بھی نہ لکھے، یہی عزیز داری ہے؟ بس آخر میں لکھ دیا کہ چند مجبوریوں کی وجہ سے بہت عجلت میں شادی کر دی گئی ہے، کسی کو بلانے کا موقعہ نہ تھا!''

''شادی؟ کس کی شادی؟'' ریاض کو ایک خوفناک شبہ گذرا۔

''عذرا کی اور کس کی۔ لو، یہ خط دیکھو!''

(۴)

وہ اس قدر جلد مجھے بھول گئی ــــــ ریاض نے سونچا اور پھر زمانہ گذشتہ کی کل باتیں اس کی نگاہوں میں پھرنے لگیں۔ اسے ہر وہ شے یاد آنے لگی جس کا زمانہ ماضی میں اس کی محبت سے تعلق تھا۔ پھر سب کے بعد اسے عذرا کے وہ وعدے یاد آئے جنہیں وہ اپنی زندگی کا بہت قیمتی سرمایہ سمجھتا تھا۔ ''میں تمہاری ہوں!'' اس کے کانوں میں عذرا کی آواز گونج رہی تھی۔ وہ پریشان تھا، اس کی روح بے چین تھی، اس کا دل دھڑک رہا تھا، وہ اطمینان چاہتا تھا، اس کی نظروں میں دنیا کی آبادی، شان وشوکت، جاہ وحشم کی کوئی حقیقت نہ تھی۔ اس کی حالت اس بدنصیب کی مانند تھی جس کا اچانک سب کچھ لے لیا گیا ہو۔ وہ بے چینی کے عالم میں ادھر ادھر ٹہلنے لگا، اور پھر ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔ اس کے ہاتھوں میں وہی کتاب تھی، ''حیات جاوداں ــــــ''

''عورت کا حسن زیور سے دوبالا ہو جاتا ہے، چاند کا داغ اس کی دلکشی کا باعث ہے۔ تاریکی روشنی کی قدر سکھاتی ہے، اسی طرح زندگی میں اگر غم نہ ہوں، حوادث نہ ہوں، ناکامی و ناامیدی نہ ہو تو وہ خوبصورت معلوم نہ ہو۔ اس میں دلکشی باقی رہے، اس کی قدر نہ کی جائے، یہ ٹھوکریں بھی جو ہمیں راہ چلنا بتاتی ہیں۔''

اس کے دماغ میں سکون کی ایک ہلکی سی جھلک نمودار ہوئی۔ خود کو تسلی دیتے ہوئے بڑبڑانے لگا۔ ''تو اس کی شادی ہوگئی، مجھے تو خوش ہونا چاہئے کہ وہ میری بہن ہے! پھر میرا دل کیوں بیٹھا جا رہا ہے؟ اس کی حرکت کیوں کمزور ہے؟ وہ کیوں بے چین ہے؟ میری محبت تو بے غرض ہے، پھر مجھے یہ تمنا کیوں تھی کہ کوئی اسکا جواب دیتا؟ لیکن اب میری محبت بالکل بے لوث ہے۔ وہ اگر کسی دوسرے کی ہوگئی تو ہو جائے، میری محبت قائم رہے گی اور زندگی کی آخری سانس تک، یہ ٹھوکریں بھی جو ہمیں راہ چلنا سکھاتی ہیں!''

وہ خاموش ہوگیا۔ اس کی نگاہیں سامنے لٹکے ہوئے کلنڈر پر پڑیں اور جم کر رہ گئیں۔ ان میں حسرتیں تھیں ناکام، ان میں آنسو تھے خشک ـــــ! یہ بیماری کی وہ حالت تھی جس میں علاج کارگر نہیں ہوتا!

(۵)

زمانہ گذرتا گیا اور عذرا کی شادی کو تین سال ہوگئے۔ ریاض کے لئے نہ عذرا کی امید تھی اور نہ خوشیوں کا انتظار۔ بے چارے کی زندگی برباد ہو کر رہ گئی تھی۔ اکثر خاموش بیٹھا گذری ہوئی باتوں کے خواب دیکھا کرتا۔ لیکن اس ٹریجڈی نے اس کی حیات روزانہ میں ایک خاص تبدیلی ضرور کردی تھی۔ وہ اب زیادہ محتاط و خوددار ہوگیا تھا۔ وہ اپنے جذبوں کو سمجھ رہا تھا اور سمجھ بوجھ کر ان کی پرورش کر رہا تھا۔ اس کی محبت عذرا کے لئے غیر فانی بن چکی تھی، اور اس کی نگاہیں ان آنسوؤں سے معمور تھیں جنہیں ہمارے شعراء و افسانہ نگار بہت قیمتی خیال کرتے ہیں۔ عذرا کی تمنا تو اس کے لئے خواب و خیال ہو چکی تھی، ہاں، یہ ارمان اس کے دل میں ضرور چٹکیاں لیا کرتا تھا کہ کبھی کبھی عذرا کو دیکھ لے اور ممکن ہو تو دو بول

گفتگو کرے۔ یہ تھی اس کی موجودہ تمناؤں کی انتہا!

پھر ایک دن بالکل اتفاقیہ اس کا لکھنؤ جانا ہو گیا۔

کہتے ہیں کہ عورت اپنے پہلے محبت کرنے والے کو کبھی نہیں بھولتی لیکن دور سے بہت کم یاد کرتی ہے۔ عذرا بھی ریاض کو نہ بھول سکی، اور جب جوانی کے رنگین مگر طوفانی جذبے تسکین پا گئے تو اسے پھر ریاض کا خیال آیا۔ خیال آیا ایک دھندلے ہوئے خواب کی مانند کہ اس سے قبل بھی اس کی دنیا کسی نے آباد کر رکھی تھی!

عذرا نے ریاض کو دیکھا اور پہلی ہی نظر میں اس کی گری ہوئی حالت کا اندازہ کر لیا۔ اس کے ہونٹوں پر ایک خفیف سا تبسم چھا گیا، اسکی نگاہوں میں فخر کی ایک ہلکی سی جھلک اور دل میں ایک تاسف آمیز خوشی تھی اس یقین کے ساتھ ـــــ ریاض نے اس کی محبت میں یہ حالت بنائی تھی! لیکن اس کی یہ وقتی مسرت فانی تھی۔ اسے بہت جلد وہ زمانہ یاد آ گیا جب یہی ریاض اس کی تمناؤں کا مرکز تھا۔ اس کی نگاہوں میں وہ ریاض پھر رہا تھا جس کے بازو بھرے ہوئے تھے، جس کی نگاہیں چمکیلی تھیں، جس کا چہرہ روشن تھا، جس کی آواز دلکش تھی، لیکن آج اس کے سامنے وہ ریاض تھا جسکے جسم پر گوشت نہ تھا، جس کی نگاہوں میں چمک نہ تھی، جس کا چہرہ زرد تھا، جس کی گفتگو میں حسرت تھی، جس کی آواز میں درد تھا!

عذرا کے دل پر ایک چوٹ سی لگی۔ وہ سامنے سے ہٹ گئی، وہ رو رہی تھی!

(۶)

ریاض و فارانی کا تعارف کرایا گیا اور ریاض نے اپنے سامنے ایک تندرست، کسی قدر سن رسیدہ مگر خوبصورت انسان کو پایا۔ جس کا تجربۂ زندگی وسیع تھا اور اس کی نگاہیں عمیق تھیں۔ جس کی خودغرض طبیعت اوروں کی تکالیف میں بھی اپنی خوشیاں ڈھونڈنا چاہتی تھی اور جس کی محتاط فطرت کو اپنے معاملوں میں کسی کا دخل منظور نہ تھا۔ دونوں میں بہت مختصر گفتگو

ہوئی اور ایک عجیب جذبے کے ماتحت ریاض نے اپنے دل کو فارانی کی جانب کھنچتا ہوا پایا۔ اس کے دل میں عذرا کی محبت کا یہ آخری درجہ تھا!

وفا کا اپنی ثبوت کیا دوں، یہ میری الفت کی انتہا ہے
کہ جس کو وہ چاہتے ہیں ہمدم میں خیر اسکی منا رہا ہوں!
(سالکؔ)

پھر اچانک عذرا کو دل کا دورہ پڑا۔ سنبھالتے سنبھالتے بیچاری بستر سے لگ گئی۔ تیمارداری کے لئے سب ہی موجود تھے لیکن ریاض کی پر خلوص لیکن خاموش خدمت نے عذرا پر جو اثر کیا وہ ڈاکٹروں کی قیمتی دواؤں سے زیادہ مؤثر تھا۔ اور آخر ایک دن ڈاکٹروں نے اپنا فیصلہ سنا دیا ـــــ مریضہ کے صحت یاب ہونے کی قوی امید تھی۔

فارانی کی عمیق نظریں ریاض و عذرا کی حالت کا بہت سخت جائزہ لے رہی تھیں، اور آخر کار ان کی دلی گہرائیوں تک پہونچ گئیں، اس کے وسیع تجربۂ زندگی نے ایسے بہت سے حوادث دیکھ ڈالے تھے!

''اچھا یہ بات ہے!'' اس نے دل ہی دل میں سوچا۔ ''تو میں انہیں موقعہ دوں گا تا کہ یہ دونوں جوانی کا رنگین مگر خوفناک کھیل کچھ اور کھیل لیں اور پھر اس کے بعد ـــــ'' اس کے خوبصورت ہونٹوں پر ایک کریہہ مسکراہٹ پھیل گئی۔ ایک ایسی مسکراہٹ جس سے کسی دلی ارادے کا پتہ چلتا ہو، ایک ایسے ارادے کا جسے ظاہر کرنا شاید پسند نہیں کیا جاتا۔

(۷)

دوپہر کا وقت تھا۔ عذرا، جس کی بیماری ایک حد تک دور ہو چکی تھی، بستر پر خاموش پڑی کچھ سوچ رہی تھی کہ ریاض اس کے کمرے میں داخل ہوا۔

''کیسی طبیعت ہے اب، بہن؟''

''بہت کچھ اچھی ہو گئی ہوں ـــــ'' عذرا نے مسکراتے ہوئے کہا۔ پھر کمرے میں ایک طویل خاموشی چھا گئی۔ ریاض تو حسب معمول خاموش تھا۔ عذرا کو تنہا پا کر وہ بہت

کچھ کہنا چاہتا اس لئے کچھ نہ کہہ سکتا۔ اس کے برسوں کے دبے ہوئے جذبے اور دل میں گھٹتے ہوئے غبار زبان پر حرف بن کر آتے مگر ہونٹوں پر آ کر مٹ جاتے اور وہ خاموش رہ جاتا۔ لیکن عذرا بھی کسی خیال میں تھی، شاید گفتگو کا کوئی ایسا پہلو تلاش کر رہی تھی جو ریاض کے لئے تکلیف دہ نہ ہو، بولی:

''تم چپ کیوں رہتے ہو، ریاض؟''

ریاض کے دل میں ایک ٹیس سی اٹھی، وہ عذرا کو جواب نہ دے سکا۔ وہ اسے نہ بتا سکا کہ وہ کیوں خاموش رہتا ہے۔ اس کی نگاہیں زمین میں گڑ گئیں۔ اس نے بے چینی سے کرسی کا پہلو بدلا اور ایک ٹھنڈی سانس لے کر رہ گیا۔

عذرا ریاض کی یہ حالت بہ غور دیکھ رہی تھی۔ اسے اپنے سوال کے اس قدر مؤثر ہونے کی امید نہ تھی۔ انتہائی نرم لہجے میں اس نے پھر پوچھا۔ ''کیوں، کیسے ہو؟''

''اچھا ہوں بہن!'' آخر کار ریاض نے جواب دیا۔ ''آپ گھڑی گھڑی کیوں پوچھتی ہیں؟''

عذرا کسی قدر اٹھ کر بیٹھ گئی۔ اس کا چہرہ تمتما رہا تھا، اس کی نگاہیں جھکی ہوئی تھیں، اسکے ہونٹوں میں ایک خفیف سی جنبش تھی۔ ریاض کی قمیص کا دامن چھوتے ہوئے بولی:

''تم مجھے بھول کیوں نہیں جاتے؟''

مرد عورت کے مقابلے میں ہمیشہ غبی ثابت ہوا ہے، ریاض بھی اس سوال کی ماہیت کو نہ سمجھ سکا۔

''ہر ایک تمہارے ایسا دل کہاں سے لائے!'' اس نے جواب دیا۔ ''لیکن میں کوشش کروں گا کہ ـــــ'' اس کی آواز گلوگیر ہوگئی۔ کمرے میں پھر سناٹا چھا گیا۔ عذرا پھر اسی طرح لیٹ گئی، وہ عورت تھی اور عورت کی مانند اپنی بے چینیاں چھپانے کی کوشش کر رہی تھی۔ پھر اس نے کروٹ لی اور اپنا منہ گداز تکیوں میں چھپا لیا ـــــ فلسفے کی موٹی موٹی کتابوں کا پڑھنے والا ریاض عورت کی نفسیات سے بے خبر تھا!

''ایک بات کہوں، مان لو گے؟'' عذرا نے دو تین دن بعد ریاض سے پوچھا۔

''کیا آج تک میں نے تمہاری کل باتیں نہیں مانیں؟'' ریاض نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

''اس لئے تو مجھے ایک خاص بات کہنے کی ہمت ہو رہی ہے، اور مجھے امید ہے کہ تم اسے بھی ضرور مان لو گے، کیوں مان لو گے نا ____؟''

''پہلے کہو تو، مانوں گا کیوں نہیں!''

''تم شادی کرلو!''

ریاض دھک سے ہو گیا۔ وہ یہ جملہ سننے کے لئے تیار نہ تھا، اس کی تمنائیں مٹ چکی تھیں، اس کے ارمان مٹ چکے تھے، اس کی زندگی تباہ ہو چکی تھی، اسے شادی کی آرزو نہ تھی۔ وہ اپنے ساتھ کسی اور کی زندگی برباد کرنا نہیں چاہتا تھا۔ اس دنیا میں اسکے لئے کوئی دلکشی نہ تھی، سوائے ایک آرزو کے اور وہ یہ کہ وہ عذرا کی محبت میں فنا ہو جائے!

''ریاض ____ !'' عذرا نے نگاہیں نیچی کرتے ہوئے کہا۔ ''مجھ سے تمہاری یہ بے چینیاں نہیں دیکھی جاتیں۔ میں تمہاری نہ ہو سکی اور نہ اب آئندہ کبھی ہو سکوں گی، تم شادی کرلو، تمہاری یکسوئی ختم ہو جائے گی، تمہارے خیالات تقسیم ہو جائیں گے، تمہارے دل بہلنے کا سامان مہیا ہو جائے گا، پھر تمہارے لئے آسان ہو گا کہ مجھے بھول جاؤ، ریاض! کوشش کرو ____''

''بس میری بہن!'' ریاض کے کمزور دل کے لئے عذرا کی یہ تقریر ناقابل برداشت تھی۔ ''بس کرو، میرے دکھے ہوئے دل کو نہ دکھاؤ، مجھے تکلیف ہوتی ہے!''

وہ اٹھا اور کمرے کے باہر چلا گیا، اور عذرا بستر پر پڑی رہی، ایک بے جان مورت کی طرح، ایک تصویر سنگ کی مانند!

(۸)

عذرا کے صحتیاب ہونے کی خوشی میں فاراتی نے ایک مختصر سی ٹی پارٹی دی۔

مخصوص مہمانوں میں ریاض کا نام سب سے اول تھا۔ آج فارانی کی خوشی کی کوئی انتہا نہ تھی۔ بات بات پر مسکرا رہا تھا، جس نے تندرست رخساروں پر ایک ہلکا سا رنگ پھیر دیا تھا۔ عذرا نے بھی فارانی کی خوشیوں کا اندازہ کیا اور مسکرائی۔

ریاض، فارانی کی مسرتوں کو ایک حسرت کی نگاہ سے دیکھ رہا تھا۔ اس کے دل میں ایک موہوم سی تمنا پیدا ہو رہی تھی کہ کاش وہ بھی اسی طرح ہنس سکتا ــــــ اگرچہ وہ ہر مذاق پر ہنس رہا تھا، تاہم ایک تاڑنے والی نگاہ پر صاف روشن تھا، اس کی ہنسی میں حقیقی مسرت کو بہت کم دخل ہے!

فارانی سگرٹ سلگاتے ہوئے ریاض سے مخاطب ہوا:

''آیئے، گراموفون بجائیں۔''

''لیکن میں بہن کے کل ریکارڈ سن چکا ہوں، اس لئے ــــــ''

''پھر بھی ہم لطف ضرور حاصل کر سکتے ہیں۔'' فارانی نے ریاض کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔ ''موقعہ پر کسی چیز کو چھوڑنا نہیں چاہئے۔'' پھر وہ ہنسنے لگا۔ ''میں دیکھ رہا ہوں کہ آپ ہماری مسرتوں میں پورا حصہ نہیں لے رہے ہیں۔ میرا مطلب یہ ہے کہ آپ کچھ خاموش ہیں، یہ تو مجھے معلوم ہے کہ آپ فلسفہ پڑھتے ہیں، لیکن اس مختصر زندگی میں اگر کل وقت فلسفے کی خاموشیوں کی نذر کر دیا جائے تو زندگی بہت کٹھن ہو جائے گی۔'' ریاض نے کوئی جواب نہیں دیا۔ اس کے پاس جواب دینے کے لئے کچھ تھا بھی نہیں۔

گراموفون بجتا رہا، رکارڈ تبدیل ہوتے رہے۔ ریاض بجائے مسرور ہونے کے کچھ زیادہ مغموم ہو گیا۔ اسے وہ زمانہ یاد آ گیا جب عذرا اپنی شادی کے قبل اسے گراموفون بجا بجا کر سنایا کرتی تھی۔

تھوڑی دیر بعد سب لوگ کھانے کی میز پر بیٹھ گئے۔ ہر طرف زندہ دلی موجیں مار رہی تھی۔ جسے دیکھو ہنس رہا تھا۔ عذرا کی چند بے باک سہیلیاں میز پر ایک دوسرے کو چھیڑ رہی تھیں۔ عذرا بھی بہت مسرور تھی اور اپنی سہیلیوں کی بات بات پر ہنسے دیتی تھی،

ریاض بھی مسکرائے بغیر نہ رہ سکا۔

کھانا ختم ہو گیا، اب آئس کریم کی باری تھی۔

''دیکھئے مسٹر ریاض!'' فارانی نے اسے مخاطب کیا۔ ''مجھے معلوم ہوا ہے کہ آپ کو آئس کریم بہت پسند ہے۔ اس لئے آج کی آئس کریم خود میں نے بنائی ہے اپنے فوجی طریقے سے، اور اس لئے پہلی پلیٹ آپ کو میرے ہی ہاتھ سے قبول کرنا پڑے گی!''

ریاض کو دراصل آئس کریم بہت پسند تھی، اور کلکتہ کے ہر نفیس آئس کریم فروخت کرنے والے رستورنٹ میں ریاض کے قدم ضرور پہنچ چکے تھے۔ اس نے فارانی کے ہاتھ سے آئس کریم کا خوبصورت بلوری کپ لیا اور اپنے آگے رکھ لیا۔ چمچہ اٹھایا اور کھانے لگا۔ فارانی کا روشن چہرہ ایک لمحے کیلئے تاریک ہو گیا تھا! کافی ہوحق کے بعد دعوت ختم ہوگئی۔

(۹)

اچانک اور شدید بخار نے ریاض کو اپنا شکار بنالیا، اس وقت جبکہ فارانی کی پر تکلف دعوت کے بعد کچھ دیر آرام کر رہا تھا۔

دوسرے دن سب ہی جمع ہو گئے۔ عذرا کو اپنی بیماری کا وہ زمانہ یاد تھا، جب ریاض نے اپنی کل کوششیں، کل قوتیں عذرا کی تیمارداری میں صرف کردی تھیں۔ اس لئے کچھ بار احسان اور کچھ دلی محبت نے عذرا کو مجبور کر دیا کہ وہ ریاض کی بے لوث خدمتوں کا اپنی خدمتوں کے ذریعہ اعتراف کرے۔

بیماری دن بدن بڑھتی گئی، بخار ہڈیوں میں پیوست ہوتا گیا، جسم کی بیرونی حرارت کم ہوگئی۔ بیماری کتنی ہی شدید کیوں نہ ہو لیکن اگر بیمار اس سے بے خبر ہے تو شفا کی بہت امید ہوتی ہے۔ برخلاف اس کے بیمار کو اپنی حالت کا احساس زیادہ مجہول کر دیتا ہے۔ ریاض تخیل پسند اور حساس طبیعت لے کر آیا تھا۔ اور یہی وجہ تھی کہ طبیبوں کی رائے کے خلاف اس کی نگاہوں میں ناامیدی کی جھلک بعض اوقات زیادہ نمایاں ہو جاتی تھی۔

ریاض محسوس کررہا تھا کہ شاید وہ اس رنگین مگر خود غرض دنیا سے ہمیشہ کے لئے رخصت ہورہا ہے۔ وہ بہت بے چین تھا اوراس کی تسکین کا صرف ایک ذریعہ تھا ــــــ عذرا کا اس کے پاس رہنا۔ وہ عذرا کو قریب پاکر ایک روحانی تسکین محسوس کرتا تھا اور جب کبھی عذرا اس کی نگاہوں سے اوجھل ہوتی تو وہ یہ سمجھتا کہ شاید وہ اسے اب کبھی نہ دیکھے گا۔ نہیں کہا جاسکتا کہ عذرا، ریاض کی اس حالت سے خبردار تھی یا نہیں، لیکن وہ ریاض کی حالت سے متاثر بہت تھی، وہ گھنٹوں اس کے قریب بیٹھی رہتی، باتیں کرتی رہتی!

دوپہر کا وقت تھا۔ ریاض کی ماں کمرے میں داخل ہوئی اوراپنے بیمار بیٹے کے قریب بیٹھ گئی۔

"کیسے ہو بھیا۔؟"

"سر میں بہت درد ہے، اماں!" ریاض نے ماں کی جانب منہ پھیرتے ہوئے کہا۔ ریاض کا اترا ہوا چہرہ دیکھ کر ماں کا دل بیٹھنے لگا، شفقت سے سر دبانے لگی ــــــ ماں کی ہستی وہ ہستی ہے جس کے قریب آکر ہم سب کچھ ہونے کے باوجود خود کو اک طفل سادہ سمجھتے ہیں۔ ماں کی آغوش میں ہمیں وہ اطمینان محسوس ہوتا ہے کہ کچھ دیر کے لئے ہم سب کچھ بھول جاتے ہیں، ہمیں کچھ یاد نہیں رہتا سوائے اس کے کہ ہم ایک ایسی جنت میں ہیں جہاں کسی کا خوف نہیں، کوئی تکلیف نہیں، کسی مصیبت کی امید نہیں، جہاں آرام ہے ابدی، مسرتیں ہیں روحانی، جہاں دنیا کی دشمنی ہم تک نہیں پہنچ سکتی۔ جب ہماری تمنائیں پوری نہیں ہوتیں، جب ہماری قسمت ناکامی کی انتہا پر آجاتی ہے، جب دنیا کا ہر گوشہ ہمارے لئے تاریک ہوجاتا ہے، جب ہم ساری دنیا کے ٹھکرائے ہوئے آتے ہیں تو ماں کی آغوش میں ایک نئی دنیا میں بس جاتے ہیں۔ اس غربت زدہ مایوس بچے کی مانند جو بھوک سے بیتاب ہوکر ہر ایک کے سامنے گیا ہو اور پھر تھک کر اپنی ماں کی آغوش میں گر پڑا ہو! ــــــ ریاض بھی تھوڑی دیر کے لئے اپنا سب کچھ بھول کر سوگیا!

دودن اور گذر گئے۔ ریاض کی حالت بظاہر کچھ اچھی تھی۔ کمرے میں کسی قدر

تاریکی پھیل چکی تھی، وہ خاموش تھا اور شاید عذرا سے آئندہ باتوں کے لئے الفاظ جمع کر رہا تھا کہ یکایک اس کی پریشانی پر کسی نے اپنا نرم ہاتھ رکھا۔ ریاض کی نگاہیں خود بخود بند ہوگئیں۔ وہ آنے والے کو کسی نامعلوم جذبے کے ذریعہ پہچان چکا تھا ـــــ وہ عذرا تھی۔

عذرا دلی محبت سے اس کا سر دباتی رہی اور ریاض ایک لذت خوابیدہ، ایک کیفیت موہوم میں غرق بے حس وحرکت اس کے نرم ونازک ہاتھوں کا لمس اپنی پیشانی پر محسوس کرتا رہا۔ وہ چاہتا تھا کہ تاقیامت اس حالت سے جدا نہ ہو، اسے اسی حالت میں موت آجائے تاہم اس نے عذرا کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لیتے ہوئے کہا:

''بس میری بہن! تمہیں بہت تکلیف ہوتی ہے، تم ہر وقت میرے پاس رہتی ہو، میرے آرام کا خیال رکھتی ہو، پھر بھی میں تمہارا کچھ خیال نہیں کرتا، کاش میں تمہاری کوئی خدمت کرسکتا! لیکن قسمت ـــــ''

''تمہاری یہ بہکی بہکی باتیں مجھے بہت پریشان کردیتی ہیں۔'' عذرا بات کاٹ کر بولی۔ ''تم خاموش کیوں نہیں رہتے؟''

ریاض کے ہونٹوں پر ایک غم انگیز مسکراہٹ چھاگئی۔

''یہ باتیں تمہیں پریشان کرتی ہیں نا؟ لیکن اب میں تمہیں زیادہ پریشان نہ کروں گا، میں جلد اچھا ہونے والا ہوں، کچھ دیر کیلئے میرا سر اور دبادو، مجھے نیند آرہی ہے۔''

کہتے ہیں کہ جمعرات کا دن مریض کے لئے بہت کٹھن ہوتا ہے۔ شاید یہی وجہ ہو کہ ریاض کی حالت بد سے بدتر ہوگئی۔ شام کا وقت تھا، ہر گھر میں آنے والی رات کی تاریکی دور کرنے کے لئے چراغ روشن کئے جارہے تھے۔ لیکن شام ہی کا وقت تھا جو ریاض کا چراغ زندگی ایک بار بھڑک کر خاموش ہونے کے لئے ٹمٹما رہا تھا۔ بظاہر کوئی نمایاں تبدیلی نہ تھی، اور اطباء کی رائے کے مطابق ہر ایک کو قوی امید تھی کہ ریاض جلد صحتیاب ہوجائے گا۔ سوائے ایک شخص کے اور وہ خود ریاض تھا، جسے اپنی حالت کا صحیح احساس تھا اور جو ایک قلبی اطمینان کے ساتھ زندگی کی کشمکش سے ـــــ وہ زندگی جس کی رنگینیاں

اس کے لئے ایک زمانہ ہوا، فنا ہو چکی تھیں۔نجات پانے کے لئے تیار تھا یا تیار ہو رہا تھا۔ زندہ رہنے کی تمنا عرصہ ہوا اس کے دل سے فنا ہو چکی تھی۔ تاہم وہ کوئی ایسی موت مرنا نہیں چاہتا تھا جو عذرا کی نگاہوں میں بھی طبعی ہو۔ تمام خودداریوں کے باوجود وہ عذرا کے دل میں کم از کم یہ یقین پیدا کرنا چاہتا تھا کہ مرنے والے کو مرتے دم تک اس سے محبت تھی اور موت کا سبب بھی محبت!

عذرا اس کے بالکل قریب بیٹھی تھی اور بے چینی سے ریاض کی حالت دیکھ رہی تھی۔ اس وقت اس کے دل میں صرف ایک خیال تھا ـــــ کاش وہ ریاض کے لئے اپنی زندگی وقف کر سکتی!

''عذرا۔!'' ریاض کی نحیف آواز نے اسے چونکا دیا۔

''میں تمہارے پاس ہوں، کہو!''

وہ خاموش ہو گیا۔ اس کا چہرہ اس کے دلی ہیجان کو نمایاں کر رہا تھا، اور جو طوفانی جذبات اس کے کمزور سینے میں موجیں مار رہے تھے، انہوں نے اس کے خشک رخساروں کو تمتما دیا تھا۔

''عذر۔!'' اس نے زبردستی مسکراتے ہوئے کہا۔ ''میں تمہیں بہت پریشان کرتا ہوں نا؟ میرا مطلب ہے کہ تمہیں میری وجہ سے بہت تکلیف اٹھانا پڑتی ہے، دن رات میرے قریب بیٹھی رہتی ہو، تم مجھ پر اتنا ترس کیوں کھاتی ہو، بہن؟''

ترس کے لفظ نے عذرا کو بے تاب کر دیا!

''مجھے ان باتوں سے بڑی الجھن ہوتی ہے۔'' وہ بولی۔ ''تم خاموش کیوں نہیں رہتے؟ طبیعت اچھی ہو جائے تو دل کھول کر باتیں کر لینا، میں کہیں چلی تھوڑی جا رہی ہوں!''

''نہیں عذرا، مجھے باتیں کرنے دو۔'' اس نے جواب دیا۔ ''میں تمہاری عنایتوں کا بدلہ تو دے نہیں سکتا، لیکن یہ تمنا ضرور ہے کہ میں پھر تمہاری کچھ خدمت کرتا۔ بڑی بڑی

آرزوئیں تھیں، عذرا بڑے بڑے ارمان تھے لیکن مجھے معلوم نہ تھا کہ اس دنیا میں ہر شئے کا معیار قائم ہے۔ مجھے اپنی حیثیت سے آگے قدم نہیں بڑھانا چاہئے تھا، مجھے اس پھول کی تمنا نہیں کرنا چاہئے تھی جس کے میں لائق نہ تھا اور جس کی بلندی تک میرے ہاتھ نہیں پہونچ سکتے تھے۔ میں قدرت کے سب سے بڑے قانون سے ناواقف تھا اور چکور ہوتے ہوئے ماہتاب کو چھونے کی کوشش کر رہا تھا، تم میری باتوں سے گھبراتی تو نہیں ہو؟ دل چاہتا ہے کہ زندگی بھر کی گفتگو آج ختم کر دوں، شاید پھر کبھی موقعہ نہ ملے، سنتے سنتے تھک جانا تو مجھ سے کہہ دینا، میں خاموش ہو جاؤں گا۔'' ریاض کی لایعنی تقریر کا سلسلہ ٹوٹ گیا، کھانسی کا دورہ شروع ہو گیا تھا۔

کھانسی ختم ہو گئی لیکن ریاض میں اب اتنا دم نہ تھا جو پھر کچھ بول سکتا، اگرچہ اس کے ہونٹوں میں ایک ہلکی سی کپکپاہٹ تھی تاہم وہ اپنی کوشش میں ناکام تھے۔

پھر ایک خوفناک چیز نمودار ہوئی۔ جس نے عذرا کو چند لمحوں کے لئے بالکل بے حس و حرکت کر دیا، اس کی نگاہیں کھلی کی کھلی رہ گئیں۔ اس نے دیکھا کہ ریاض کی بے رونق نگاہوں سے آنسوؤں کے دو آوارہ قطرے مرجھائے ہوئے رخساروں پر لڑھکتے ہوئے آئے اور تکیے کے غلاف میں جذب ہو گئے!

عذرا اپنا دل تھام کے بیٹھ گئی۔ یہ اس کے لئے بالکل نیا نظارہ تھا۔ اس نے ریاض کی آنکھوں میں کبھی آنسو نہیں دیکھے تھے۔ ریاض کے ہونٹوں کو ایک خفیف سی جنبش ہوئی، وہ اس پر جھک گئی تاکہ اس کے آخری الفاظ سن سکے اور اس نے ایک دھیمی آواز سنی۔ ''مجھے تم سے محبت ہے ——!'' اس نے نگاہیں بند کر لیں، وہ ایک ایسی نیند سو گیا جسے دنیا والے بیدار نہیں کر سکتے!

''ریاض——!'' عذرا کے منہ سے ایک چیخ نکلی۔ کمرے میں سب جمع ہو گئے۔

(11)

ریاض کو دنیا چھوڑے ہوئے ایک زمانہ گذر گیا۔ عذرا اب ایک خوبصورت لڑکی

کی ماں تھی!

برسات کا ابتدائی موسم تھا۔ عذرا لڑکی کا ہاتھ پکڑے اپنے مکان کے چھوٹے سے باغ میں آئی اور ایک بنچ پر بیٹھ گئی۔ سامنے بیلے کے پھول کھلے ہوئے تھے، اس کی نگاہیں ان پھولوں میں گڑ کر رہ گئیں۔ اس کے سامنے وہ زمانہ آگیا جب اس کی شادی نہیں ہوئی تھی، جب ریاض اسے طرح طرح کے پھول لا کر دیا کرتا تھا، جب وہ ان پھولوں کے ہار گوندھا کرتی تھی اور کبھی کبھی ریاض کے گلے میں ڈال دیتی تھی۔ پھر اسے ریاض کا خیال آیا جو ہمیشہ کے لئے اس سے دور ہو چکا تھا، بہت دور۔ ''اب دلی محبت سے کوئی بہن نہیں پکارتا!'' اس نے سوچا۔ ''تم کیوں چلے گئے، ریاض!'' اس کا دل بھر آیا، اس کی نگاہیں تر ہو گئیں۔

''کیوں، کیا سوچ رہی ہو؟'' فارانی نے اچانک پس پشت آ کر کہا۔ پھر اس کے قریب بیٹھ کر اس کے بالوں پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بولا۔ ''کس خیال میں ہو۔؟''

''سوچ رہی ہوں کہ بہت سی ایسی کلیاں بھی ہیں جو کھلنے سے قبل ہی مرجھا جاتی ہیں۔ مجھے ان کی بدنصیبی پر ترس آتا ہے، کیوں ترس آنا چاہئے نا۔؟''

''مجھے اتنی فرصت نہیں جو کھلنے والے پھول اور مرجھانے والی کلیوں کا گفتار رہوں'' فارانی نے ہنس کر جواب دیا۔

عذرا چپ ہو گئی۔ اس کے چہرے سے معلوم ہوتا تھا کہ کسی خاص جذبے کو دبانے کی کوشش کر رہی ہے۔ فارانی کے کوٹ کا کالر موڑتے ہوئے بولی۔ ''کیوں، تم نے کسی سے محبت بھی کی ہے؟''

فارانی مسکرانے لگا۔ اس کی نگاہیں انتقامانہ جھلک سے معمور ہو گئیں۔

''اور تم نے۔؟''

عذرا سنبھل کر بیٹھ گئی۔

''کیا تم سچ مچ سننا چاہتے ہو۔؟''

''یقیناً!''

عذرا کے دماغ میں خیالات کی جنگ شروع ہوگئی۔ کہے یا نہ کہے، پھر یکا یک اس کے چہرے پر سنجیدگی آگئی ہڑ بڑا کر دھیمی آواز میں بولی! ''تمہیں یاد ہے میرا ایک خالہ زاد بھائی تھا، ریاض!''

''ہاں!''

''جو کبھی کبھی لکھنؤ آتا تھا اور جس نے میری بیماری میں بڑی محبت سے تیمارداری کی تھی۔''

''ہاں۔!''

''اور جو ہمارے جلسے سے واپس جا کر بخار میں مبتلا ہوگیا، جس کے علاج کے لئے تم نے لکھنؤ کے اچھے اچھے ڈاکٹروں کو بلایا تھا، اور جس نے آخر کار میرے سامنے ہمیشہ کے لئے اپنی آنکھیں بند کر لی تھیں۔''

''ہاں!۔''

''مجھے اسی سے محبت تھی!''

فارانی نے جیب سے سگرٹ کیس نکالا اور ایک سگرٹ سلگا کر ہلکے ہلکے تین چار کش لگائے۔ ''لیکن تمہیں یہ بھی معلوم ہے کہ اس کی فوری موت کا کیا سبب تھا؟'' فارانی نے پوچھا۔ ''نہیں ـــــ!'' عذرا نے آنکھوں میں مچلتے ہوئے آنسوؤں کو خشک کرتے ہوئے کہا۔ ''میں نے اسے زہر دے دیا تھا، آئس کریم میں!''

☆☆☆

مطبوعہ عالمگیر، لاہور، ستمبر 1938ء
اور مصور، ممبئی، 26 رمئی 1950ء

صندوق ـــــــ!

ہلکی ہلکی پھوار پڑ رہی تھی۔ چائے کے گرد ہم چار کاہل آدمی بیٹھے ہوئے خوش گپیاں کر رہے تھے ـــــ کاہل، ملک کے کاہل باشندے جن کا مقصد زندگی بیس تیس کی نوکری اور بی۔اے، پاس کرلینا ہو، فرصت کے اوقات میں سوائے اسکے اور کر ہی کیا کرسکتے ہیں۔اس لئے ہم بھی وہی کر رہے تھے جس کی عادت پڑ چکی تھی۔ہم سب ہنس رہے تھے، نقالوں کی مانند، خوش ہو رہے تھے۔ دلی مسرت سے دور ہوکر اور پی رہے تھے چائے کی پیالیاں، گویا شراب ناب کے جام ہیں ـــــ برقی چولہے پر کیتلی بہت دیر سے گنگنا رہی تھی۔

میری نوکری صاحب بہادر کی ناراضگی کی وجہ سے چھوٹ چکی تھی۔ظفیر کا کالج اور رشید کا آفس بند تھا۔صاحب ابھی ابھی ڈاکٹری کے امتحان میں فیل ہوکر نکلے تھے ـــــ ہر پانچ منٹ بعد کسی نہ کسی کے ہاتھ میں چائے کی پیالی نظر آجاتی تھی۔

گفتگو کا موضوع بدلتا رہا، معاشرت سے سیاست پر، نئے نظام حکومت سے سیاسی قیدیوں پر، اور آخر میں اخلاق پر ـــــ ظفیر و موہن موجودہ تہذیب کے حامی تھے، میں کسی فیصلہ پر پہونچنے کی کوشش کر رہا تھا۔ رشید جو ہم سب میں بڑا و تجربہ کار تھا۔موجودہ زمانہ کو غلامی کا پھندہ اور تہذیب کو بے حیائی و بے مروتی کا کارخانہ بتا رہا تھا۔ میں خاموش تھا، دونوں اس کے خلاف دلائل پیش کر رہے تھے، فرسودہ اس لئے ہوئے، بے معنی-اور وہ ان دونوں کے خلاف آواز بلند کر رہا تھا، موٹے موٹے لفظوں میں، قوموں کی مثالیں پیش کرتے ہوئے، رنگین جملوں کے ساتھ-!

ہر شخص اپنی کہہ رہا تھا مگر کوئی سن کر سمجھنے کی کوشش نہیں کر رہا تھا۔ یکا یک رشید اپنی

گرجدار آواز میں بولا:

''میں اپنی بستی کا ایک واقعہ سناتا ہوں جو لوگوں کی آنکھوں دیکھی بات ہے، اور اسی سے معلوم ہوجائے گا کہ آج کل کے تہذیب زدہ لڑکے اپنے بڑوں کے ساتھ کیسا سلوک کرتے ہیں، پھر میں آپ سے پوچھوں گا کہ.....''

''لیکن بات کیا ہے؟'' ظفیر و موہن، رشید کی بات کاٹ کر بولے۔'' ذرا ہم بھی تو سنیں۔!''

(۱)

اور رشید نے یہ قصہ بیان کیا:

''میری بستی سے پانچ میل دور ایک اور بستی ہے جہاں منشی ''امیر احمد'' کا خاندان آباد ہے۔ منشی جی ایک پرانے خیال کے بزرگ تھے، لیکن اس قدر قدامت پرست نہ تھے کہ اپنے لڑکوں کو موجودہ تعلیم سے بھی دور رکھیں۔ چنانچہ جب ان کے دونوں لڑکوں نے انٹرنس پاس کرلیا تو منشی جی نے علی گڑھ بھیج دیا تا کہ اعلےٰ تعلیم حاصل کریں۔

منشی جی ایک نرم دل، ملنسار، اور نیک طبیعت آدمی تھے۔ جوانی کا زمانہ بہت کامیاب گذرا تھا اور ان لوگوں کی مانند جنہوں نے اپنے زور بازو پر ثروت حاصل کی ہو، بہت خوددار و کم آمیز بھی تھے۔ دوستوں کا حلقہ بہت محدود تھا۔ کہتے تھے کہ دوستی آسان ہے، نباہنا مشکل! لیکن جو تھے وہ دلی دوست تھے۔ زیادہ یارانہ تھا لالہ پریم چند ساہوکار سے، جو منشی جی کے مکان سے قریب رہتے تھے۔

اب سنئے کہ جب ان کے دونوں لڑکے پاس کر کے نکلے تو ان میں سے ایک اپنی شادی بھی کرتے آئے۔ لڑکی تھی تو ہنس مکھ مگر وہی تہذیب، گھر کے کام کاج میں دل ہی نہ لگتا تھا، گھبرائی گھبرائی پھرتی۔ کہتی، دیہاتی گھر نہیں قید خانے ہوتے ہیں۔ لیکن منشی جی ان عام باتوں کا بہت کم اثر لیتے، وہ نہ کسی کے بیچ میں بولتے اور نہ کسی بات میں دخل دیتے، جانتے تھے کہ کسی وقت وہ بھی جوان تھے اور دنیا اس سے زیادہ کمسن و رنگین تھی!

ایک دن بیٹھے بیٹھے سوچا کہ لاؤ جو کچھ بھی ہے، اس کا حصہ بخرہ کردوں۔ ایسا نہ ہو کہ اچانک آنکھ بند ہوجائے اور دونوں بھائیوں میں کچھ ان بن ہو، یہی سوچ کر چلے اپنے دوست لالہ پریم چند کے یہاں صلاح لینے۔

لالہ جی آواز سن کر باہر آئے اور دیکھتے ہی اپنے بیٹے کو پکارا۔

''منوا، او منوا، کرسی لے آ کرسی! منشی چچا آئے ہیں اور دیکھ، اپنی ماں سے کہیو کہ منشی جی کے لئے دو پان بھی لگا دیں، سنا؟'' کرسی آئی، اور پان بھی آئے۔ منشی جی کرسی پر بیٹھ گئے اور ایک پان منہ میں رکھتے ہوئے بولے:

''پریم بھائی، میں تم سے اس وقت ایک صلاح لینے آیا ہوں اور وہ یہ کہ جو کچھ ٹوٹا پھوٹا اپنا ہے، وہ جیتے جی ہی بٹ جائے تو اچھا۔ اللہ ہی کو معلوم، بعد کو کیا آفت آئے، دونوں لڑکوں میں بنے یا نہیں، اس لئے چاہتا ہوں کہ دونوں کا حصہ الگ کردوں۔ کیوں، کیا خیال ہے تمہارا؟''

لالہ جی کو خواب میں بھی خیال نہ تھا کہ بیٹھے بیٹھے منشی جی کے پیٹ میں چوہے دوڑ پڑیں گے، رہے سہے کا بٹوارہ کرنے کے لئے! تین چار لمبی لمبی سانسیں اور ایک چھوٹی سی ڈکار لینے کے بعد بولے:

''بھئی میری تو سمجھ میں نہیں آتا، کیوں بیٹھے بٹھائے دوسروں کے محتاج بنو۔ برا نہ مانو تو کہوں کہ چاہے اپنے ہوں یا پرائے، دنیا ہے مطلب کی۔ ابھی جو تمہاری خوشامد میں دو چار لگے رہتے ہیں تو وجہ یہ کہ تمہارا دھن تمہارے پاس ہے۔ یہ ہاتھ سے گیا تو اپنے بھی پرائے بلکہ بدتر ہوجائیں گے۔ آگے تم جانو۔''

''تمہارا خیال تو خیر غلط نہیں۔'' منشی جی نے جواب دیا۔ ''لیکن تمہارا ڈر ضرور فضول ہے۔ اول تو میری عمر ہی کیا رہ گئی ہے جو کوئی میرے ساتھ برائی کرے گا۔ دوسرے، میرے دونوں لڑکے پڑھے لکھے ہیں، میرا ادب بھی کرتے ہیں، دوسری بہو ذرا زبان

دراز ضرور ہے لیکن وہ بھی حد سے آگے نہیں بڑھتی۔ بڑا تو تم جانتے ہی ہو کہ گھوم پھر کر کچھ کما لاتا ہے، چھوٹا بھی تحصیل میں کوشش کر رہا ہے۔ میری اچھی گذر جائے گی۔''

''نہ بھائی!'' لالہ بات کاٹ کر بولے۔ ''میں تو ایسی رائے نہیں دیتا، آئندہ تم مختار ہو۔ اپنے بچوں کو مجھ سے زیادہ سمجھتے ہو، لیکن یہ سوچ لو کہ اپنے نین گنوا کر در در مانگے بھیک!''

منشی جی نے پان کی دوسری گلوری منہ میں رکھی، کچھ دیر خاموش بیٹھے رہے، پھر یکا یک کھڑے ہو گئے۔ رخصتی سلام کیا اور دل ہی دل میں باتیں کرتے، سر ہلاتے، گھر کو چل پڑے۔

(۲)

گھر پہونچ کر منشی جی خاموش لیٹ گئے، سوچتے رہے۔ لالہ کی باتیں دل میں چبھتی ہوئی معلوم ہوتیں، کئی بار خیال آیا کہ لالہ کی رائے میں اس کی کوئی ذاتی غرض تو شامل نہیں ہے، لیکن دوسرا خیال ہمیشہ پہلے کی تردید کر دیتا۔ بھلا کسی کو کیا، اگر میں اپنا سب کچھ لٹا دوں؟

دن ہفتوں میں تبدیل ہو گئے لیکن منشی جی اپنے خیال کو عملی جامہ نہ پہنا سکے۔ جب ارادہ کرتے، لالہ پریم چند کی رائے راستہ روک کر کھڑی ہو جاتی۔ گئے تھے روزے کو، گلے پڑی نماز۔ گئے تھے صلاح لینے، پریشانیاں ساتھ لیتے آئے۔ اس درمیان میں جب کبھی لالہ پریم چند کا سامنا ہوتا، منشی جی نگاہیں چرا لیتے۔ راستہ کترا جاتے، ڈرتے تھے کہ وہ بات پھر نہ چھڑ جائے۔

آخر ایک دن اپنی پریشانیوں سے تنگ ہو کر وہ چپکے سے رجسٹرار کی عدالت میں پہونچے اور راتوں کی نیند حرام کر دینے والی فکر کا خاتمہ کر کے واپس آ گئے۔ وہ اپنے ارادے کو عملی جامہ پہنا چکے تھے۔ اس رات انہیں سکون کی نیند آئی، دلی کش مکش سے نجات پا کر یکسوئی کے ماتحت!

بہت دنوں تک تو لالہ پریم چند اس خبر سے بے خبر رہے، لیکن آخر کہاں تک بات پھیلی اور ان کے کانوں میں بھی بھنک پڑ گئی۔ سناٹے میں آ گئے۔ ساہوکار تھے، اور روپیہ کی قیمت منشی جی سے زیادہ سمجھتے تھے۔ دنیا کا زیادہ تجربہ تھا کیونکہ زیادہ آدمیوں سے ملے تھے، بہت دیر تک خاموش بیٹھے سوچتے رہے۔ پھر اٹھے اور چلے منشی جی کے مکان کی جانب!

منشی جی نے دور سے ان کو آتے دیکھا تو دل دھڑکنے لگا۔ ڈر ہے کہ کہیں راز کھل تو نہیں گیا۔ شرمندگی چہرے سے نمایاں ہوگئی۔ لالہ جی کے پوچھنے سے پہلے ہی بولے:

''بھئی میں تو دونوں کے حق سے ادا ہوگیا!''

اور لالہ نے جواب دیا:

''لیکن تم نے برا کیا۔''

(۳)

پہلے سال کی عشرتیں منشی جی کی امید سے زیادہ تھیں۔ ان کا ہر کام بغیر کہے ہو جاتا، ہر ضرورت بلا وقفہ پوری ہو جاتی۔ لڑکے ہر خدمت کو تیار تھے اور بہوئیں ان کے آرام کے لئے کوشاں، اور اس خاطر و مدارات، اس رنگین سلوک کے درمیان منشی جی کو کبھی بھولے سے بھی یہ خیال نہ آیا کہ لالہ پریم چند کی رائے بھی صحیح ہو سکتی ہے۔ اگر کبھی لالہ سے ملاقات ہو جاتی تو منشی جی فخریہ کہتے:

''بھئی میری تو اچھی گذر رہی ہے!''

چھ مہینے - ایک سال، اور گذر گیا۔ پھر رفتہ رفتہ منشی جی کے ساتھ برتاؤ میں فرق آنے لگا۔ دوسری بہو پہلے بابا کہا کرتی تھی، اب کبھی کبھی دبی زبان سے ''بوڑھا کھوسٹ'' بھی کہہ لیتی۔ لڑکے دونوں وقت سلام کر کے خیریت پوچھا کرتے تھے، اب سامنے آنا کم کر دیا تھا۔ پہلے دسترخوان پر سب بیٹھ کر کھانا کھاتے تھے، اب اکثر منشی جی کا کھانا الگ آیا کرتا تھا۔

حالات بد سے بدتر ہوگئے۔ منشی جی باہر صحن میں گھنٹوں، شاید بھوکے پڑے رہتے

لیکن کوئی بات تک نہ پوچھتا۔ پھر کوئی آ کر دو روٹی اور دال یا سالن دے جاتا۔ بدمزہ، باسی، اور وہ اسے کھاتے، مجبوراً، بمشکل۔ لیکن طبیعت کی خودداری خدا سے بھی شکوہ کی اجازت نہیں دیتی تھی۔ پریم چند کی صلاح خدائی آواز معلوم ہو رہی تھی!

پریم چند نے آنا کم کر دیا تھا لیکن اکثر اپنے بیٹے 'منوا'' کو بھیج کر اپنے دوست کی خیریت دریافت کر لیتے تھے۔ ایک دن جب منوا جانے لگا تو منشی جی نے اس سے کہا کہ لالہ جی کو ذرا بھیج دے ـــــ لالہ جی سنتے ہی چل پڑے۔

منشی جی اپنی ٹوٹی چارپائی پر بیٹھے تھے، لالہ جی بھی قریب آ کر بیٹھ گئے۔ دونوں چپ تھے، شاید گفتگو کا موضوع تلاش کر رہے ہوں۔ آخر منشی جی نے طلسم سکوت توڑا:

''کیوں بھائی، مجھ سے کیا خطا ہوئی کہ تم نے آنا ہی چھوڑ دیا؟ سچ ہے برے وقت میں کوئی کسی کا شریک نہیں ہوتا، تم نے بھی نگاہیں پھیر لیں؟''

''نگاہیں وگاہیں تو خیر کیا پھیر لیں'' لالہ بولے۔ ''لیکن میں نے جان کر آنا کم کر دیا تھا، اس لئے کہ مجھے دیکھ کر تمہیں پچھلی باتیں نہ یاد آ جائیں اور تمہیں تکلیف ہو۔''

منشی جی پھر چپ ہو گئے، انہیں دراصل اپنا پچھلا زمانہ یاد آ گیا تھا۔ چہرے پر حسرت برسنے لگی، دل آہوں سے معمور ہو گیا، نگاہیں آنسوؤں سے۔ ضبط کرتے ہوئے بولے:

''تمہارا خیال سچ تھا!''

لالہ کی نگاہیں ایک لمحہ کے لئے فتح مندانہ چمک سے معمور ہو گئیں اور پھر دوست کی حالت پر تاسف سے!

(۴)

وقت گذرتا رہا۔ دنیا کی عمر کم اور منشی جی کی عمر زیادہ ہوتی گئی۔ عمر کے ساتھ ان کی تکلیفیں بھی بڑھتی رہیں۔ بیٹوں اور بہوؤں کی نگاہوں میں ان کی ہستی ایک بے مصرف، تکلیف دہ، فضول چیز تھی۔ اس لئے بے چارے کی قدر نہ کی جاتی، ان کی تکلیفوں کا خیال نہ

کیا جاتا، ان کی ضرورتوں کی شنوائی نہ ہوتی۔ ضعیفی کا سب سے بڑا دشمن دمہ، اکثر ان کی پسلی پسلی توڑ دیتا مگر کوئی دھیان تک نہ دیتا، کوئی پشت تک نہ سہلاتا، کوئی یہ بھی نہ پوچھتا کہ بابا تمہارا کیا حال ہے! منشی جی دل ہی دل میں موت کی دعائیں مانگتے، مگر موت کمبخت بھی بُرے وقت میں آنے سے انکار کر رہی تھی!

لالہ پریم چند نے کتنی بار کوشش کی کہ منشی جی ان کے کسی سلوک کو قبول کر لیں مگر منشی جی کی خوددار طبیعت نے ہمیشہ انکار کر دیا، ہمیشہ اپنی تکلیفوں کو ترجیح دی!

(۵)

پندرہ دن گذر گئے، منشی جی کے دمہ میں کچھ کمی تو ضرور تھی لیکن تیمارداری کو کوئی نہ تھا۔ بے چارے کو بعض اوقات پانی تک خود اٹھ کر پینا پڑتا تھا، جب زیادہ طبیعت جھلاتی تو خود کو اور گھر والوں کو کوسنے لگتے۔ کہتے، کیا اسی دن کے لئے پالا تھا، لیکن گھر والے سنتے اور ٹال جاتے، سنتے اور ہنستے کہ بڈھا تو یوں بکا ہی کرتا ہے۔

ایک دن اسی طرح بیٹھے اپنی قسمت کو رو رہے تھے کہ لالہ ایک مزدور کے سر پر ایک صندوق لئے آئے اور چلا کر بولے:

"لیجئے منشی جی یہ اپنی امانت، اس کے لئے کہ پرسوں میرے گھر میں چوری ہوتے ہوتے رہ گئی اور میں اب یہ مکان بھی چھوڑ رہا ہوں۔ اس لئے چاہتا ہوں کہ آپ کی چیز آپ کے سپرد کر دوں، بھگوان جانے بعد کو کیا ہو کیا نہ ہو، تو کسی کا بوجھ تو اپنے سر پر نہ رہے۔"

منشی جی ہکا بکا خاموش کھڑے لالہ جی کو نظر جمائے دیکھتے رہے، نہ سمجھ سکے کہ یہ معاملہ کیا ہے۔ کئی بار بولنے کی کوشش کی مگر کامیابی نہ ہوئی، اور لالہ ہیں کہ بکے ہی چلے جا رہے ہیں ——

"میں تو ایسی دوستی سے باز آیا، آپ نے تو کہا تھا کہ کچھ دنوں کے لئے یہ صندوق اپنے یہاں رکھ لو، مناسب موقعہ دیکھ کر اٹھوا لوں گا، ابھی لڑکے بالے گھر میں ہیں، مگر وہ

آپ کا مناسب موقعہ اب تک آیا ہی نہیں۔ لیجئے سنبھالئے اپنا عذاب، کل کہیں مر گئے تو آپ کے لڑکے میرا سر کھا جائیں گے کہ لایئے بابا کا مال۔''

''بھائی پریم، یہ تمہیں کیا ہو گیا ہے؟'' لالہ نے منشی جی کی بات کاٹی۔ ''اور اگر تمہیں یہ ڈر ہے کہ اسے کہاں اور کیوں کر رکھو گے تو آؤ ترکیب میں بتاتا ہوں۔ زمین تو کچی ہے ہی، اسی میں گڑھا کھود کر اسے دفن کر دو اور بچھالو اس پر اپنی چارپائی، بس۔'' اور قبل اس کے کہ منشی جی کچھ بولیں، لالہ نے مزدور کو حکم دیا کہ زمین کھودنا شروع کر دے!

منشی جی گم صم کھڑے دیکھتے رہے، سوچتے رہے کہ کہیں لالہ پاگل تو نہیں ہو گئے۔ سوچتے رہے کہ کہیں ان کا مذاق تو نہیں اڑایا جا رہا ہے۔ پھر انہیں ایک اور خیال آیا۔ کہیں یہ سب خواب تو نہیں؟ صندوق گڑا چکا تھا!

اور جب لالہ جانے لگے تو چپکے چپکے منشی جی سے کچھ باتیں کہیں، پھر اپنے گھر کو چل دیئے۔ لالہ کے چلے جانے کے بعد منشی جی دیر تک وہیں کھڑے رہے جہاں لالہ سے باتیں ہوئی تھیں، ان کی آنکھوں میں آنسو چھلک رہے تھے۔ ایک ٹھنڈی سانس لی اور اپنے پلنگ کی طرف آ گئے۔

(٦)

منشی جی کی حیات روزانہ میں ایک عجیب تبدیلی آ گئی تھی، لڑکے کچھ کچھ بات کرنے لگے تھے، بہویں قرینے سے کھانا لانے لگی تھیں، کبھی کبھی سر بھی دبا دیا جاتا تھا۔

لالہ کبھی کبھی آتے۔ منشی جی کا سر نیچا ہو جاتا، نگاہیں تشکر سے معمور ہو جاتیں۔ لیکن وہ فوراً چلے جاتے، دوستی اظہار تشکر سے گھبراتی تھی۔

پھر یہ ہوا کہ لالہ اپنا مکان اور زمین وغیرہ بیچ کر کاشی چلے گئے، عمر کا آخری حصہ گنگا کی زمین پر گذارنا چاہتے تھے۔ منشی جی کے جان پہچانی تو بہت تھے مگر دوست کوئی نہ تھا۔ اکثر گھبرا جاتے تو لکڑی ٹیک کر کچھ دور گھوم آتے۔ زندگی کی تمنا نہ تھی، موت آنے کا نام نہ لیتی تھی!

یکا یک ایک دن منشی جی کو دمہ کا بہت شدید دورہ ہوا۔ کھانستے کھانستے کلیجہ منہ کو آ گیا، لیکن بظاہر تکلیف کم معلوم ہوتی تھی کیونکہ تیمارداری کو لوگ موجود تھے۔ بیٹے، بہوئیں اوران کے نوکر ـــــ کیونکہ صندوق کے مالک اب تک منشی جی تھے!!

پھر حالت بہت خراب ہوگئی، سانس کی رفتار میں فرق آ گیا۔ منشی امیر احمد کے مرجھائے ہوئے چہرے پر موت کی رونق آ گئی۔ دونوں بیٹے گاؤں کے ڈاکٹر کے پاس دوڑتے، اس لئے نہیں کہ شفیق باپ بچ جائے، اس لئے کہ گاؤں والے انہیں بدنام نہ کریں، نالائق نہ کہیں۔

لیکن ڈاکٹر نے مریض کو دیکھتے ہی سمجھ لیا کہ اس کا آنا بعد از وقت تھا اور اس نے صاف صاف کہہ دیا کہ مریض کے بچنے کی کوئی امید نہیں۔ وہ اس میں کچھ نہیں کر سکتا۔

دونوں بھائیوں کے چہرے تمتما اٹھے، باپ کے غم میں نہیں، صندوق ملنے کی خوشی میں!

آخر وہ وقت آ گیا جب منشی امیر احمد کی حسرت انگیز ضعیفی کو اس رنگین دنیا کے خوبصورت پنجوں سے چھڑانے کے لئے موت خاموشی وسکوت کے ساتھ آگے بڑھی۔ منشی جی کے چہرے پر اطمینان کی ایک عجیب چمک آ گئی۔ آنکھیں کھلیں کہ ایک بار اور کچھ دیکھ لیں اور پھر بند ہو گئیں۔ دنیا کی طاقت اب انہیں کھول نہیں سکتی تھی!

(۷)

گاؤں کی پوری آبادی منشی جی کے مکان پر جمع ہوگئی۔ ہر شخص مرنے والے کی تعریف کر رہا تھا، ہر زبان پر انہیں کا ذکر تھا، ان کی نیکیوں کا ذکر۔ ان کی رواداری، خودداری کا ذکر ـــــ!

لیکن لڑکوں کو کفن دفن کی فکر تھی، گھر میں نقد روپیہ موجود نہ تھا، اور جو تھا وہ نہ ہونے کے برابر تھا۔ معمولی طور پر ٹال بھی نہیں سکتے تھے ورنہ عزیز واقارب، اپنے پرائے، اور گاؤں کے لوگ کیا کہیں گے کہ جو شخص سب کچھ دے گیا اس کا مرنا بھی لڑکوں نے کیا تو کس

بری طرح سے! آخر دونوں بھائی اس فیصلہ پر پہونچے کہ اپنی اپنی بیویوں کے سونے کے کڑے رہن رکھ کر کام نکالا جائے تا کہ لاش بھی گھر سے اٹھ جائے اور کسی پر راز بھی نہ کھلے۔ بعد کو صندوق میں سے جو نکلے اس سے کڑے چھڑانے کے بعد برابر سے حصہ ہو جائے!

تجویز ٹھیک تھی۔ دونوں بھائی کڑوں پر پانچ سات سو کی رقم لے آئے اور حقیقت میں خوب دھوم سے بڈھے کا مرنا کیا۔ دل کھول کر خیرات دی گئی اور برادری کو موت کی پر تکلف دعوت۔ کڑوں پر لائے ہوئے روپے تو ختم ہو گئے لیکن گاؤں میں یہی چرچا تھا کہ لڑکے تھے بہت لائق!

(۸)

کچھ دنوں مرنے والے کا غم مٹانے کے بعد دور کے رشتہ دار اور مہمان چلے گئے، فقیروں کی دعائیں بند ہو گئیں اور خیرات کی صدائیں موقوف ______

اب صندوق نکلنے کا وقت آ گیا تھا۔ مزدوروں کو بلانا مناسب نہ سمجھا گیا، ممکن تھا کہ وہ پورے گاؤں میں مشہور کر دیتے کہ اتنا مال نکلا۔ اس لئے دونوں بھائی اور ان کی بیویوں نے خود صندوق نکالنے کا ارادہ کر لیا۔ سب صندوق پر چمٹ گئے۔ مٹی کھودنا شروع کی۔ کسی کا کرتا پھٹا اور کسی کا ڈوپٹہ۔ اللہ اللہ کر کے صندوق باہر نکالا تو اس میں ایک مضبوط قفل پڑا ہوا تھا۔

''ابا جان نے کس حفاظت سے اسے رکھا تھا!'' ایک نے ہانپتے ہوئے تعجب سے کہا۔

''یقیناً اس میں کم مال نہ ہوگا۔'' دوسرے نے دبی زبان سے تائید کی۔

''اور کیا ورنہ وہ اپنے سامنے اسے زمین میں کیوں گڑواتے؟'' دوسری بہو بولی۔

''اور تمہیں لالہ کا پکار کر کہنا بھی یاد ہے کہ لیجئے سنبھالئے اپنا عذاب!'' پہلی بہو نے یاد دلایا۔

کلہاڑی کی سخت ضربوں سے قفل ٹوٹ گیا۔ ڈھکنا اٹھایا گیا، ٹاٹ اور پرانے

کپڑوں کی تین چار تہیں جیسے ہی اٹھائی گئیں کہ دونوں بہویں چیخ مار کر پیچھے ہٹ گئیں، دونوں بھائی سر سے پیر تک کانپنے لگے۔ صندوق میں پہلے کچھ پھٹے پرانے کپڑے تھے اور اس کے بعد چند نفیس سرخ اینٹیں اور بہت سے رنگین وزنی پتھر!!!"

رشید کا فسانہ ختم ہو گیا، ہم لوگوں نے ایک دوسرے کو نظر اٹھا کر دیکھا اور پھر چائے کی کیتلی کی طرف بڑھے۔ وہ ٹھنڈی ہو چکی تھی۔

☆☆☆

مطبوعہ رسالہ "صہبا" کلکتہ دسمبر 1938ء
اور "عالمگیر" لاہور، جنوری 1941ء

قمار باز ـــــــ !

میں نے کچھ دنوں کے لئے اپنا تخلص سالکؔ سے بدل کر قیصر کرلیا تھا۔ وجہ یہ تھی کہ جس زمانے میں میں اسکول میں پڑھتا تھا تو جناب عبدالفتح صاحب ہاشمی اس اسکول کے ایک ماسٹر تھے۔ ان کی قابلیت میں تو کسی کو شبہ تھا نہیں مگر ان کی ذہنیت کچھ عجیب پر تعصب اور مطلب پرست تھی۔ میرے مضامین اور افسانے جو رسالوں میں شائع ہوتے وہ انہیں سخت ناگوار گذرتے تھے اور آخر میں وہ یہاں تک اتر آئے کہ اسی بہانے مجھ پر اپنی بید بازی کی مشق کیا کرتے تھے۔ جب میرا کوئی افسانہ کہیں چھپتا، آپ فوراً تین چار بید مجھ پر رسید کردیتے۔ آخر تنگ آکر میں نے اپنا تخلص ہی بدل ڈالا اور یہ افسانہ قیصر کے نام سے رسالہ ''ہمایوں'' کو بھیجا۔ کچھ دنوں بعد مجھے اپنی کمزوری کا احساس ہوا اور میں نے ارادہ کرلیا کہ مجھے سالک ہی کے نام سے مضامین لکھنا چاہئیں۔ چنانچہ میں نے اڈیٹر صاحب ہمایوں کو پھر خط لکھا کہ براہ کرم اس افسانے کو قیصرؔ کے نام سے نہیں بلکہ سالکؔ کے نام سے شائع کریں۔ مگر وہاں سے جواب آیا کہ افسانہ شائع ہو چکا ہے اس لئے میری التجا بیکار ہے۔

(۱)

سامنے نوٹوں کا بنڈل پڑا تھا۔ جان نے چپکے سے اپنے پیروں کے نیچے دبا لیا اور پھر پیر کھجانے کے بہانے جھک کر نوٹ جیب کے حوالہ کردیا ـــــ وہ مشہور جواری تھا۔

سڑک کی لالٹین کے قریب پہونچ کر اس نے نوٹ گنے، پانچ پانچ کے بیس نوٹ! کل سو روپیہ! وہ مسکرا کر آگے بڑھ گیا۔ ایک بند مکان کے قریب پہونچ کر وہ رکا اور پھر سب کی نظر بچا کر چپکے سے مکان میں داخل ہوگیا ـــــ یہ ایک مشہور قمار خانہ تھا۔

یہاں رنگ برنگ کے آدمی تاش کھیلنے میں مشغول تھے، اس نے ایک اچٹتی ہوئی نگاہ سب پر ڈالی۔ کسی کا چہرہ خوشی سے جگمگا رہا اور کسی پر مایوسی کے تاریک بادل چھائے

ہوئے تھے ـــــ وہ بھی ان میں شریک ہو گیا۔

اس نے بازیاں لگانا شروع کیں اور دس دس کے دس داؤں ہارنے کے بعد وہ مکان سے باہر آ گیا۔ اسے کسی قدر افسوس تھا اور جب وہ اس سڑک پر پہونچا جہاں اسے نوٹ ملے تھے تو اسے سخت تعجب ہوا کہ ایک بیس بائیس برس کی لڑکی چاروں طرف کچھ ڈھونڈ رہی ہے۔ جان نے اپنے دل میں ایک ہلکی سی خلش محسوس کی۔

''آپ کیا ڈھونڈ رہی ہیں؟'' اس نے زبردستی مسکراتے ہوئے پوچھا۔

''جی، میں نے سو روپیہ کی چیک بھنائی تھی، مگر بنک سے کچھ ہی دور گئی ہوں کہ معلوم ہوا کہ نوٹوں کا بنڈل کہیں گر گیا، میں وہی ڈھونڈ رہی ہوں!''

جان نے ادھر ادھر دیکھتے ہوئے کہا: ''ہوں، تو تم نوٹ ڈھونڈ رہی ہو، سو روپیہ کا نوٹ، اچھا اگر میں بتا دوں؟''

لڑکی جلدی سے چلا اٹھی۔ ''تم کو معلوم ہے؟ تو پھر بتاؤ مجھے، کہاں ہیں وہ نوٹ؟ اچھا ہوا کہیں کسی اور کے پلے پڑتے تو غضب ہی ہو جاتا، وہ لیکے غائب ہو جاتا اور میں ہاتھ ملتی رہ جاتی۔''

جان نے رک رک کر کہا۔ ''مگر وہ نوٹ ـــــ اب میرے پاس ـــــ کہاں؟''

''کیا کیا؟''

جان نے صاف صاف کہا۔ ''وہ نوٹ اب میرے پاس نہیں ہیں!''

لڑکی کو غصہ آ گیا۔ ''کیا کہا تم نے؟ نوٹ اب نہیں ہیں؟ تو پھر گئے کہاں؟''

''میں ہار گیا!''

''ہائیں! ہار گئے! کیا زیادہ پی گئے ہو؟ کیسے ہار گئے، کیوں ہار گئے، کیا حق تھا تم کو ہارنے کا! بولو؟''

جان نے پروقار آواز میں جواب دیا: ''معاف کیجئے گا خاتون! زندگی کا نام ہار جیت اور ہار جیت کے جوار بھاٹے کا نام زندگی۔ یہ دنیا اور اس دنیا کی کل کائنات

ہار جیت کے فیض سے قائم ہے۔ کل کیا ہوگا، کون جانتا ہے، اور پھر ـــــ اور پھر ـــــ ''

عورت نے ڈانٹ کر کہا۔ '' چپ! کیا بکتا ہے۔'' سیدھی طرح سے نوٹ حوالے کرو ورنہ بلاتی ہوں پولس کو ـــــ دغا باز کا بچہ!''

'' ان باتوں سے فائدہ؟ پولس کے ذریعہ تمہارے ہاتھوں خاک بھی کچھ نہ آئے گا۔ اس سے بہتر ہے کہ جو میں کہوں، وہ کرو!''

'' اچھا کہو، کیا کہتے ہو؟ میرے پاس بیکار باتوں کا وقت نہیں ہے۔''

'' تم نے سچ کہا۔ وقت کم بخت بھی بڑا قمار باز ہے۔ ہاں تو میں ایک شریف کا بیٹا ہوں، میرے پاس ابھی کچھ دولت ہے، بالکل فقیر نہیں ہوں۔ انسانی زندگی کی ہر چیز جوا ہے، میں ابھی تھوڑی دیر پہلے تاش کھیل رہا تھا مگر قسمت بری تھی کہ سو تمہارے اور بیس اپنے بھی ہار گیا اور ـــــ ''

عورت بات کاٹ کر بولی۔ '' خاموش بدمعاش، چور!'' اور وہ غصہ و ناامیدی سے کانپنے لگی۔ اس کی موٹی موٹی آنکھوں میں آنسو بھر آئے ـــــ جان کا دل بھی رحم سے بھر آیا، بولا:

'' تمہارے روپوں کے ضائع ہونے کا مجھے صدمہ ہے۔ اگر میں بازی جیت جاتا تو تمہیں ضرور حصہ دیتا، مگر ذرا سوچو تو کہ اگر کسی دوسرے بے ایمان شخص کو نوٹ ملتے تو تم کہاں ڈھونڈتی پھرتیں؟ میری اور تمہاری دونوں کی قسمت کا پھیر تھا جو میں ہار گیا اور اب میں کیا کر سکتا ہوں، سوائے اس کے کہ تمہاری ہر خدمت کو حاضر ہوں، بتاؤ کیا کام ہے!''

عورت بھوکی شیرنی کی طرح چلا اٹھی۔ '' بڑے کام کا بچہ بن کر آیا ہے، چور زمانے بھر کا!'' روپیہ سے ناامیدی نے اسے بیتاب کر دیا تھا۔

'' جو جی چاہے کہو۔ میں جوا کھیلنا نہیں چھوڑ سکتا۔ دنیا کی زندگی، موت، طرز معاشرت، کھانا پینا، اٹھنا بیٹھنا، غرض ہر بات میں جوا ہی جوا نظر آتا ہے۔ اس لئے میرا مذہب بھی جوا ہے، میں تمہارے سو روپیہ کے لئے سیدھی راہ نہیں چھوڑ سکتا۔ یہ اور بات تھی کہ اس وقت میں ہار گیا۔ اگر اب بھی میرے پاس کچھ دام ہوتے تو جھٹ جا کر جوا کھیلتا

اور جیت لاتا۔"

عورت کچھ نہ بولی، خاموشی سے اس کی باتیں سمجھنے کی کوشش کرتی رہی۔ جان بولا:

"تم شاید سمجھی نہیں- میرا مطلب ہے کہ جوئے میں کبھی انسان ہارتا ہے اور کبھی جیتتا ہے، بار بار تھوڑے ہی ہار سکتا ہے۔ میں خود ابھی ایک پل میں ہزار روپیہ جیت سکتا ہوں، تمہارے پاس دس روپے تو ضرور ہوں گے۔ یعنی تم اگر دس روپے مجھے اور دیدو تو ابھی تمہارا ہارا ہوا مال واپس ہو سکتا ہے، سمجھ گئیں تم؟"

عورت بولی- "بے شرم! سو کو تو جہنم میں جھونک آیا اور اب دس میں اور آگ لگانا چاہتا ہے! دور ہو، پاجی کہیں کا!"

"جی! قسم ہے کہ آپ کے روپے برباد نہ ہوں گے۔ رہی ہار جیت تو وہ ہوتی ہی رہتی ہے، کبھی ہم جیتے کبھی وہ! ہاں تو پھر لایئے دس روپے، ابھی آپ کے روپے واپس آجائیں گے اور آپ کو صرف گھنٹہ بھر انتظار کرنا پڑے گا۔ اچھا ہو اگر آپ اس ہوٹل میں انتظار کریں، اس سامنے والے ریسٹوران میں۔"

عورت کو کچھ کچھ یقین ہو چلا تھا، چپکی کھڑی رہی، پھر دھیمی آواز میں بولی:

"اور تم میرے پاس واپس آؤ گے نا؟"

"ضرور، جواری کبھی جھوٹ نہیں بولتا!"

عورت پھر پس و پیش میں پڑ گئی۔ روپیہ دے یا نہ دے، ایسے شخص کا کیا اعتبار جو دوسروں کے روپے سے جوا کھیلتا پھرے۔ مگر معلوم تو کچھ شریف سا ہوتا ہے، جہاں سو گئے وہاں دس اور سہی، اگر جیت لایا تو آنسو پونچھ جائیں گے۔ جان بولا:

"دیکھئے، آپ کے روپوں کا مجھے بہت افسوس ہے کہ بیکار ہار گیا، اسی وجہ سے چاہتا ہوں کہ جاؤں اور جیت لاؤں، ورنہ مجھے اس وقت خود فرصت نہ تھی جو کہیں آتا جاتا، مگر کیا کروں صرف آپ کے نوٹوں کا خیال ہے، جو پھر قمار خانہ جا رہا ہوں۔ اچھا تو پھر جلدی کیجئے۔"

عورت نے دس کا نوٹ نکالا اور جان کے ہاتھ پر دے مارا۔

''لے بھائی، تیرا ایمان جانے، میں سامنے ریسٹوران میں بیٹھی ہوں، اگر گھنٹہ بھر نہ آیا تو پھر پولس کو خبر کردوں گی، سمجھ گئے؟ ہاں، اپنا نام تو بتاؤ!''

''میرا نام ہے مسٹر جان، 12 وسٹن روڈ۔'' ـــــ اور وہ چلا آیا۔

ایک-دو-تین-جان نے جاتے ہی دس بارہ داؤں جیت لئے اور دم بھر میں اس کے پاس آٹھ سو کی رقم ہوگئی۔ تمام کھلاڑیوں نے اس کی خوب خوب پیٹھ ٹھونکی، اور وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ اسے ڈر تھا کہ اگر پھر ہار گیا تو؟

(۲)

عورت رستوران میں کافی پی رہی تھی کہ جان نے پہونچ کر کہا:

''لو دیکھو، جیت لایا۔ میں نہ کہتا تھا کہ دنیا کی ہر شے میں جوا ہے اور دنیا کی ہر شے جواری!''

عورت حیران رہ گئی-''جیت لائے، خوب! جیت لائے- میں تو نا امید ہو چکی تھی، اچھا ہوا، لاؤ دو!''

جان نے آٹھ سو روپے کے نوٹ اس کے ہاتھ پر رکھ دئے۔

''خاتون معاف کرنا! میں نے تمہیں بڑی تکلیف دی۔ اب یہ سب تمہارے ہیں!''

عورت کو یقین نہ آیا-''سب میرے ہیں؟ اور تم؟ تم کچھ نہ لوگے؟'' مسکرا کر ـــــ ''پھر جوا کیوں کر کھیلو گے؟''

''نہیں، میں ایک پائی بھی نہ لوں گا۔ روپے تمہارے تھے، اگر ہار جاتا تو کیا کرتیں تم؟''

عورت نے مارے خوشی کے دیوانی ہوگئی۔

''بھئی واہ، تم بڑے اچھے آدمی ہو۔ میری پہلی باتوں کو معاف کر دینا-دس روپے میں آٹھ سو! بھئی واہ!''

جان نے جواب دیا-''یہی تو جوئے میں مزہ ہے۔ دم بھر میں امیر غریب ہو جاتا ہے اور غریب امیر۔ یہ جوئے کی گردش ہے اور اسی گردش کا اصل نام ہے قسمت کا پھیر!''

عورت خاموشی سے کافی پیتی رہی۔ اس کے دماغ میں طرح طرح کے خیالات

آرہے تھے اور پھر چہرے سے لالچ ٹپکنے لگا تھا۔ گلوگیر آواز میں بولی:

''تو لو یہ روپیہ، پھر جا کر کھیلو۔ کل ہزار مجھے دیدینا اور باقی سب تمہارا۔ میں یہیں بیٹھی ہوں، جاؤ، سمجھ گئے!''

جان نے رک رک کر کہا۔ ''اچھی بات ہے، جو ہوگا دیکھا جائے گا۔''

عورت نے دوبارہ کافی کا آرڈر دیا اور دیر تک پیالی سے نکلتی ہوئی بھاپ پر نظر جمائے رہی۔ اس کی نگاہوں کے سامنے پیالی کی بھاپ سے ہزاروں روپے کے نوٹ بن بن کر میز پر جمع ہو رہے تھے۔ اس نے سوچا۔ ایسا شریف، نیک، ایماندار شخص میں نے اپنی زندگی میں کبھی نہیں دیکھا تھا، وہ کسی قدر خوبصورت بھی تو تھا۔ اس نے کافی کی پیالی اٹھائی اور پھر رکھ دی۔ پھر اٹھائی اور پھر رکھ دی۔ اب کافی ختم ہو چکی تھی کہ ایک لڑکا اس کی میز کے قریب آ کر رک گیا:

''کیا آپ ہی کا نام میری اسٹیفن ہے؟''

''ہاں، کیوں؟''

''یہ خط ہے، آپ کے نام!''

میری نے جلدی سے خط کھولا، صرف ایک سطر لکھی تھی:

''قسمت کی ہار نے جیت کا پانسہ الٹ دیا، میں بازی ہار گیا،

جان!''

☆☆☆

[مطبوعہ: رسالہ ''ہمایوں'' اگست 1935ء

نقل- (i) تیج ویکلی دہلی، ستمبر 1935ء

(ii) ہند روزانہ جنوری 1936ء

(iii) پرتاپ، لاہور جنوری 1936ء

سزا ـــــ !

(۱)

یہ بادلوں کی دنیا تھی۔ ہر طرف بادل ہی بادل تھے، بھورے غلیظ، خوشنما، پہاڑوں کی چوٹیوں سے ٹکراتے ہوئے، ہواؤں کے تھپیڑے کھاتے ہوئے، گرجتے، برستے، بڑھتے ہوئے بادل ـــــ ہمیں اس بار دارجلنگ آئے ہوئے چوتھا دن تھا اور ہمیشہ کی مانند اس بار بھی گھوم پھر کے جو وقت بچتا وہ باتونی بڈھے کے چھوٹے سے قہوہ خانے میں صرف ہو جاتا۔ یہ قہوہ خانہ بلندی پر واقع تھا اور اس وقت ہم دونوں کے علاوہ کوئی خریدار نہ تھا، ہم دونوں بہت دیر سے خاموش تھے کیونکہ بہت دیر تک ادھر ادھر کی باتیں کرتے رہے تھے۔ دوران گفتگو میں ہم اکثر خاموش ہو جاتے، کوئی نیا موضوع سوچنے کے لئے، بادلوں کی یورش دیکھنے کے لئے، عینک کے شیشے اور کوٹ کی آستینیں صاف کرنے کے لئے! ہماری گفتگو پھر شروع ہو جاتی، کبھی کبھی جہاں ہم رکتے وہیں سے، کبھی کبھی کسی نئے موضوع پر۔ یہ ہماری فرصت کے لمحے تھے، اس بے نیاز، بے فکر فرصت کے لمحے جو ہمیں احساس فرض بہت دور پھینکتے ہوئے خدا معلوم کتنی دنیاؤں کی سیر کرالاتے ہیں ـــــ یکا یک اس نے پھر گفتگو کا سلسلہ چھیڑا اور وہیں سے چھیڑا جہاں ہم دونوں ایک سفید چوٹی کے نظارے میں کھو کر اسے چھوڑ چکے تھے۔

''تو پھر تم کسے بہادر سمجھتے ہو؟'' اس نے پوچھا۔

جواب دینے سے قبل میری نگاہ بادل کے اس ٹکڑے پر جا پڑی جس سے سورج کی نحیف کرنیں چھن چھن کر میری چائے کی پیالی پر پڑنے لگی تھیں۔ میں تقریباً اپنا جواب بھول چکا تھا، میں نے پھر پوچھا۔

''ہاں تو بتاؤ، کسے بہادر سمجھتے ہو تم؟''

''میں تو اسے بہادر سمجھتا ہوں جو اپنے فرض کی انجام دہی میں ہر قسم کی قربانی کو جائز رکھے۔'' میں نے جواب دیا، بغیر یہ سوچے ہوئے کہ مجھے کیا کہنا چاہئے۔ ''میں تو اس وحشی کو بھی بہادر سمجھتا ہوں جو صرف اس لئے ایک عورت کا گلا گھونٹ دیتا ہے کہ یہی اس کے سردار کا حکم تھا!''

اس نے کسی قدر بے چین ہو کر کہا۔ ''چھی، کس کام کی ایسی بہادری جو دنیا کے ہر مذہب کے ہر قانون سے دور ہو!''

ہم دونوں ایک تیسری آواز سے چونک پڑے ——

''اگر حضور اجازت دیں تو'' اور پھر کہنے والا رک گیا۔ یہ بڈھا چائے خانے کا مالک تھا۔ جسے خاموش و بے حس دیکھ کر ہم لوگوں نے اس طرح فراموش کر دیا تھا گویا وہ بھی میز کرسیوں کی مانند کوئی غیر ذی روح شے تھی۔

''اگر حضور مجھے اجازت دیں تو۔'' اس نے اپنی سفید، طویل ڈاڑھی کو، جو کسی بادل کی پروردہ معلوم ہوتی تھی، ہوتے ہوئے پھر کچھ کہنے کی اجازت چاہی۔ اور پھر ہمارے چہروں کو اس طرح دیکھنے لگا گویا وہ دل میں ہمت افزائی تلاش کر رہا ہے تا کہ اپنی کوئی داستان دہرائے۔ اکثر جب ہم اپنی باتوں سے اکتا جاتے تو اس کی باتیں سنا کرتے —— وہ ایک رنگین دستان گو تھا۔

''کیوں، تمہیں کچھ اپنی بہادری کے بارے میں کہنا ہے کیا؟ میں نے ہنستے ہوئے پوچھا۔

''اپنی بہادری؟'' بڈھے نے کہا۔ ''میں بہادر ضرور تھا حضور، مگر اب تو میں بزدل ہوں، کیونکہ میری زندگی میں، خود میری زندگی کے واسطے، ایک ایسی بہادری، ایک ایسی جرأت پیش کی گئی جس کے آگے میں خود کو بزدل ہی سمجھنے میں تسلی پاتا ہوں۔ تو حضور اگر اجازت دیں تو میں بیان کروں کہ میری اور عمر کی بہادری میں کیا فرق تھا۔ اور پھر مجھے یقین

ہے کہ میرا بیان سننے کے بعد حضور بھی عمر کو بہادر ہی سمجھیں گے، ایک اصل بہادر جس کی بہادری کو بہت ممکن ہے آپ ایک معیار کا درجہ دیں۔ یہ دوسری بات ہے کہ آپ مجھے بزدل نہ سمجھیں، تو حضور۔"

"اچھا تو سناڈالو تم اپنی داستان، مگر دیکھو۔"

"کہانی بہت دلچسپ ہوگی حضور، بہت ہی دلچسپ، کیوں کہ یہ کہانی نہیں واقعہ ہے، میری زندگی کا واقعہ!" اور اس نے یہ داستان سنائی:

(۲)

"میری عمر کے پچپن (۵۵) سال گذر چکے ہیں، جوانی کے گناہوں اور بڑھاپے کے افسوس سے معمور پورے پچپن سال! میری تندرستی، جسکا بچا کھچا نمونہ آج بھی آپ کے سامنے ہے۔ عام نوجوانوں کی نگاہوں میں وہی درجہ رکھتی تھی جو ایک لکھ پتی کی دولت فاقہ مست کے لئے رکھتی ہے۔ آنے والے حادثوں سے بے پروا، اپنی دھن میں مست، میں دنیا اور دنیا والوں کو ٹھکرانے کے لئے ہمیشہ بے چین رہتا تھا! زندگی کی مشکلیں میرے لئے وہم اور آسانیاں میری ملکیت تھیں۔ میرا اس دنیا میں کوئی نہ تھا اور مجھے اس کی پروا بھی نہ تھی۔ ابھی اٹھارہ انیس سال ہی کی عمر تھی کہ میرے والدین مجھے اس وسیع، رنگین، حادثوں سے معمور دنیا میں تنہا چھوڑ کر اس سفر پر روانہ ہو گئے جو ہر ایک کو ایک ہی منزل کی جانب لے جاتا ہے۔"

"دیکھو جی۔" میں نے اسے ٹوکتے ہوئے کہا۔ "اگر تم یونہیں ذرا ذرا سی بات کو طول دیتے رہے تو تمہاری داستان ختم بھی نہ ہوگی اور ہم چل دیں گے۔"

"میں معافی چاہتا ہوں، حضور!" باتونی بڈھے نے اپنی داستان پھر شروع کی۔ "مگر حضور یہ دنیا بھی تو ایک داستان ہے، ایک طویل داستان، اس سے کوئی نہیں گھبراتا۔ ہاں تو ایک دن خدا معلوم جی میں کیا آیا کہ میں نے پہاڑوں کی سیر کا ارادہ کر لیا۔ یہی پہاڑ جو آج آپ کے سامنے ہیں، یہ سفید چوٹیاں جو اکثر آپ کی نگاہوں کو اپنی طرف کھینچ لیتی

ہیں، مجھے اپنے دامن میں لئے لئے پھریں۔ مجھے پہاڑوں کی خاموش دنیا کچھ ایسی بھلی معلوم ہوتی کہ میری سکوں ناآشنا طبیعت بھی اس سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکی۔ پھر نہیں معلوم کیوں اور کیوں کر میں نے خود کو پہاڑوں کی زندگی پر مائل پایا۔ قصہ مختصر میں نے انہی پہاڑوں کی بلندیوں میں اپنی زندگی گذارنے کا تہیہ کرلیا۔ میں اب ایک پہاڑی تھا!''

یہ بادلوں کی دنیا تھی، بادل آرہے تھے اور جارہے تھے، پہاڑوں پر پہاڑ تعمیر ہورہے تھے، گرجتے، برستے، بڑھتے ہوئے بادل ——

''شروع شروع'' بڈھے نے اپنی داستان جاری رکھی۔ ''شروع شروع ان گھاٹیوں میں بسنے والے نوجوان کچھ عجیب سے معلوم ہوئے مگر رفتہ رفتہ میں ان کی وحشی عادتوں کا عادی ہوگیا۔ میں نے خود کو ان جیسا بنانے کی کوشش کی اور میں بہت جلد کامیاب ہوگیا، آخر کیوں نہ ہوتا؟ میری فطرت خود بچپن سے اکھڑ واقع ہوئی تھی۔ تھوڑی بہت تعلیم نے تہذیب کا جو باریک غلاف اس پر چڑھا دیا تھا، جوان پہاڑی نوجوانوں کی صحبت میں تارتار ہوگیا اور میں ایک بار پھر اپنے فطری روپ میں تھا۔ بات بات پر لڑ بیٹھنے والا، بدمزاج، وحشی۔''

میرے ساتھی کو شاید خنکی محسوس ہونے لگی تھی۔ اس نے گلوبند کو کانوں تک لپیٹ لیا، گھٹنوں پر پڑی ہوئی اونی چادر شانوں تک پہونچ گئی۔ بادل ایک دوسرے سے ٹکرا رہے تھے، بے تاب تھے پہاڑوں کی کنواری چوٹیوں کو چھونے کے لئے، بڑھ رہے تھے، گرج رہے تھے، برس رہے تھے، یہ بادلوں کی دنیا تھی۔

''دن یونہیں گذرتے رہے حضور'' باتونی بڈھے نے کہا۔ ''پھر ہمارے چھوٹے سے پہاڑی گاؤں کے لئے ایک نیا واقعہ پیش آیا۔ ایک دن میری ہی طرح سے ایک اور نوجوان اس گاؤں میں نظر آیا۔ دبلا پتلا، بڑی بڑی آنکھیں، بکھرے ہوئے بال، کچھ خوفزدہ سا، شاید دنیا کے کسی تہذیب زدہ کونے سے اس طرف آنکلا تھا۔ لڑکے اس کے گرد جمع ہوگئے۔ تالیاں بجانے لگے، وہ کچھ گھبرا سا گیا، اس کی نگاہوں میں بے کسی جھلکنے لگی۔'' بڈھا

کہتے کہتے رک گیا، ایک لمبی سانس لی، ذرا کھنکھارا، پھر بولا۔ ''حضور، جہاں تک مجھے یاد ہے، زندگی میں پہلی بار مجھ میں رحم کا جذبہ نمودار ہوا، میرا دل اس اجنبی کی حالت پر مچل گیا، میں نے آگے بڑھ کے اس کا ہاتھ تھام لیا، اسے اپنے گھر لے آیا ـــــ بہت جلد ہم دونوں ایک دوسرے کے دوست بن گئے۔

''اس کا نام عمر تھا، وہ لکڑی کے کام کا ماہر تھا۔ ایک اچھا خاصا بڑھئی، تھوڑے ہی عرصے میں اس نے اپنی آمدنی پیدا کرلی اور مجھ سے نزدیک نشیب میں اپنا گھر الگ کرلیا۔ ہم دونوں کی انسیت بڑھتی رہی۔

''ہماری یہ انسیت زیادہ عرصے تک قائم نہ رہ سکی۔ ایک دن مجھے خود بخود یہ احساس ہوا کہ عمر کی نگاہیں نگار کی تمنا سے معمور ہیں۔ یہ خیال مجھے آپے سے باہر کردینے کے لئے کافی تھا۔ عذرا، وہ حسین پہاڑی لڑکی، جس کے لئے خدا معلوم کتنے نوجوان لڑکے اپنا گھر بار چھوڑ چکے تھے، بہت جلد میری ہونے والی تھی۔ میں نے ہی نگار اور عمر کا تعارف کرایا تھا۔ اس احساس نے مجھے بے چین کردیا، مشکوک کردیا، جب کبھی میں دونوں کو موٹی گفتگو کرتے ہوئے پاتا تو سمجھتا کہ محبت کی باتیں کررہے ہیں۔ میرا یہ شک کہاں تک صحیح تھا، میں نہیں کہہ سکتا۔ مگر میں نے نگار کے برتاؤ میں ایک خاص تبدیلی ضرور محسوس کی۔ میں نے دیکھا کہ وہ مجھ سے کس قدر کشیدہ خاطر اور عمر سے مانوس تر ہوگئی ہے۔ یہ میرے لئے حد سے زیادہ تھا، انتہا سے زیادہ تھا، میری فطرت کی تمام وحشت مجھ پر حاوی ہوگئی، اور میں موقعہ ڈھونڈنے لگا کہ کیوں کر انتقام لوں۔ انتقام جو موت پر ختم ہو، انتقام جو تمام نفرتوں کو اپنے دامن میں لئے ہوئے ہو، انتقام جو دل کی پیاس بجھادے۔ مجھے اس سے نفرت ہوگئی، بے انتہا نفرت، گویا وہ کوئی گھناؤنی مردار، شے تھا، حضور، نفرت انسان کو اندھا کردیتی ہے، نفرت کے پردوں میں مقابل کی اچھائیاں بھی برائیوں کا جامہ پہن لیتی ہیں، میری نگاہوں میں عمر برائیوں کا مجسمہ بن گیا تھا، خودغرض، احسان فراموش، کمینہ ـــــ''

بڈھے کا گلا خشک ہوگیا تھا، اس نے پانی کا پورا بھرا ہوا گلاس اپنے حلق میں

انڈیل لیا۔ اس نے نفرت کا ذکر کچھ اس طرح کیا تھا گویا یہ کل کا واقعہ ہے اور آج بھی وہ اس جذبۂ نفرت سے اتنا ہی معمور ہے جتنا شاید اس وقت ہو ـــــ اچانک میری نگاہ جو اٹھی تو منظر ہی عجیب تھا۔ بادلوں کی فوجیں پہاڑوں سے ان کی چوٹیاں چھیننے کے لئے بڑھی چلی آ رہی تھیں، ہوائی قلعے تعمیر ہو رہے تھے جن کی لہریں کبھی کبھی چمک اٹھتی تھیں، پھر جنگ شروع ہوگئی، ہواؤں کے تھپیڑوں نے طوفانوں کی شکل اختیار کر لی گویا وہ اپنے غصے میں پہاڑوں کو جڑ سے اکھاڑ پھینکیں گے۔ خون کی جگہ پانی برس رہا تھا، یہ جنگ تھی، بادلوں کی جنگ، پہاڑوں کی جنگ، بجلی اور طوفان کی جنگ۔ درخت اکھڑ رہے تھے، پتھر لڑھک رہے تھے، ذرا دیر میں کچھ نہ تھا، بادلوں نے سب کچھ فتح کر لیا۔ ہماری نگاہوں کے سامنے صرف ایک چادر تھی، سفید، بھوری، غلیظ چادر جو پوری کائنات پر چھا گئی تھی۔ بوڑھے نے قہوہ خانہ کی کھڑکیاں بند کر دیں۔ ہم دونوں نے گرم گرم کافی طلب کی۔

''آخر ایک دن۔'' بڈھے نے اپنی داستان پھر شروع کی۔ ''ایک دن مجھے عمر کو چھیڑنے کا موقعہ مل گیا۔ جمعہ کا دن تھا اور وہ شاید نماز پڑھ کر آ رہا تھا، سر جھکائے ہوئے، کسی خیال میں گم، آہستہ آہستہ۔ میں اچانک اس طرح اس کی راہ میں آ گیا کہ اگر دھکا لگے تو خطا اسی کی معلوم ہو۔ نہیں معلوم کہ وہ کس خیال میں گم تھا کیونکہ قبل اس کے کہ وہ سنبھل سکتا، وہ اس طرح مجھ پر آ رہا گویا حملہ کر رہا ہے۔ میں جان کر گر پڑا، میں نے کچھ نرم گرم الفاظ کہے، اس نے معافی مانگنا چاہی۔ میں اور بگڑ گیا، طیش میں آ گیا، راہگیر جمع ہو گئے، بچے، جوان، بوڑھے۔ لوگوں نے ہم دونوں کو سمجھانا چاہا اور آخر میں یہ کہہ کر آگے بڑھ گیا کہ اگر ہمت ہے تو کل ڈیما میں آ جانا!''

''ڈیما؟ یہ ڈیما کیا چیز ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''حضور کو نہیں معلوم؟ میں نے اس لئے نہیں بیان کیا کہ شاید حضور جانتے ہوں۔ یہ ایک چھوٹا سا پہاڑی میدان ہے جو نشیب میں واقع ہے۔ میرے زمانے میں اکثر نوجوان وہاں کبڈی اور دیگر کھیل کھیلا کرتے تھے۔ اس وقت وہ ایک مشہور جگہ تھی مگر اب تو وہاں شاید

ہی کوئی جاتا ہو سوائے ان بکریوں کے جنہیں ہم چرنے کیلئے بھیج دیتے ہیں۔ مجھے اس شب نیند نہیں آئی، میں دوسرے دن کے انتظار میں تھا۔ یہ انتظار نہ تھا، مکمل بے چینی تھی جس نے مجھے اپنے بستر سے بیزار کر دیا تھا، گویا میرے بستر پر انگارے بچھے ہوئے تھے۔''

بڈھا خاموش ہو گیا، گویا اپنے ذہن میں کسی خاص اور اہم واقعہ کی یاد تازہ کر رہا تھا، گویا وہ کوئی ایسی شئے ڈھونڈ رہا تھا جسے پانے کے لئے وہ تیار نہ تھا۔ اس نے پھر ایک ٹھنڈی سانس لی جس میں شاید ندامتیں بھری ہوئی تھیں اور اپنی داستان شروع کر دی۔ بادل قہوہ خانے کی کھڑکیوں سے ٹکرا رہے تھے۔

آخر دوسرا دن آ گیا، وہ دن جس کا مجھے انتظار تھا۔ میں عام وقت سے بہت پہلے وہاں پہونچ گیا اور بے چینی سے عمر کا انتظار کرنے لگا۔ مجھے یقین تھا کہ وہ ضرور آئے گا کیونکہ پہاڑوں پر بسنے والے کسی کی دھمکی برداشت نہیں کرتے، شام ہونے والی تھی۔

''رفتہ رفتہ بہت سے نوجوان وہاں جمع ہو گئے، بچے اور بوڑھے بھی۔ یہ خبر آگ کی طرح پھیل چکی تھی کہ اس دن مجھ میں اور عمر میں مقابلہ ہونے والا تھا۔ آخر وہ آتا دکھائی دیا جس نے نوجوانوں میں ایک جوش پیدا کر دیا۔ حضور وہ آیا اور میری آتش غضب پر تیل چھڑکتا ہوا آیا، میں نے دیکھا کہ نگار بھی اس کے ساتھ چلی آ رہی ہے!''

''یہ چیز مجھے از خود رفتہ کرنے کیلئے کافی سے زیادہ تھی۔ میں لپک کر اس کے قریب پہونچا اور اپنی پوری طاقت سے پہاڑی زبان میں چلایا کہ۔'' اے او چھوکرے، اگر اپنی ماں کے دودھ کی عزت چاہتا ہے تو آ مقابلہ کر!''

''حضور! میری آواز نے ایک سناٹا پیدا کر دیا۔ نوجوان خاموش ہو گئے، ہر شخص اس انتظار میں تھا کہ دیکھیں اب کیا ہوتا ہے، اگرچہ ہر ایک جانتا تھا کہ کیا ہونے والا ہے۔ میں اس کے کسی سخت جواب کا منتظر تھا مگر اس کے جواب نے تمام لوگوں کو حیرت میں ڈال دیا۔ اس نے جواب دیا کہ جس کی توقع کوئی پہاڑی نوجوان نہیں کر سکتا تھا۔ اس کا جواب پہاڑی کی جرأت و ہمت کے بالکل برعکس تھا۔ حضور، اس نے میری آواز سنی اور لڑنے سے

انکار کر دیا۔ اس نے کہا کہ خدا کے دو بندوں کا فضول باتوں پر لڑنا مذہب اور انسانیت کے خلاف ہے، اس لئے وہ نہیں لڑے گا!

''سننے والے نوجوان نے انگلیاں دانتوں میں دبالیں، اتنی بڑی بزدلی کا اظہار ان کی زندگی میں کبھی نہ ہوا تھا، مذہب اور انسانیت یہ الفاظ ان کی سمجھ سے باہر تھے۔ کبھی پہاڑی مسجد کے مولوی اور لبنانی مندر کے پجاری نے بھی تو ایسی باتیں نہیں کی تھیں، پھر وہ اس بزدلی کو مذہب اور انسانیت کیسے سمجھتے؟ جو نوجوان ذرا پر جوش تھے انہوں نے اسے اپنے گاؤں کی توہین سمجھا اور میں نے دانت پیس کر کہا کہ۔ ''اگر تجھ میں لڑنے کی ہمت نہیں ہے تو مذہب اور انسانیت کا نام لے کر جی کیوں چراتا ہے، بزدل کہیں کا!''

''اور سب نوجوان اور بچے اور بوڑھے یکبار چلا اٹھے۔ ''بزل کہیں کا!''

''میں نے نگار کی طرف دیکھا، اس کا چہرہ شرم وغصہ سے سرخ ہو رہا تھا، گویا وہ بھی دل ہی دل میں کہہ رہی تھی۔ 'بزدل کہیں کا!''

قہوہ خانے کی کھڑکی کے باہر بادل آرہے تھے اور جا رہے تھے، بھورے، غلیظ، خوشنما بادل! درخت جھوم رہے تھے، ہواؤں میں ایک ایسی بھینی بھینی خوشبو بسی ہوئی تھی جو ہمیں مست کئے ڈالتی تھی۔ طوفان ختم ہو چکا تھا اور کائنات پر وہ سکوت طاری تھا جو عموماً کسی پرشور ہنگامے کے بعد پیدا ہو جاتا ہے۔ بادل تھکے ہوئے سپاہیوں کی مانند جھوم جھوم کے ابھر رہے تھے۔ میرا ساتھی داستان کی دلچسپیوں میں کچھ ایسا گم ہو گیا تھا کہ اسے یہ ہوش بھی نہ رہا کہ اس کی شال اسکے جسم کے بالائی حصے سے ہٹ کر نیچے آگئی ہے۔ میں نے شال اٹھا کر اس کے کاندھوں پر ڈال دی۔ جواب میں اس کی تشکر آمیز نگاہیں اٹھیں اور پھر اس طرح جھک گئیں گویا باتونی بڈھے کی داستان کا پورا بار سنبھالے ہوئے ہیں۔

''پھر کیا ہوا؟'' میرے ساتھی نے بچوں کی مانند پوچھا۔

بڈھے کی آنکھوں میں فخر کی ایک ہلکی سی چمک جاگ اٹھی اس یقین کے ساتھ کہ اسکی داستان نے کم از کم ایک دل کو متوجہ کر لیا۔

''اس کے بعد حضور'' بڈھے نے داستان شروع کی۔ ''عمر کی زندگی بالکل بدل گئی یا یوں کہیے کہ اسے بدل دیا گیا۔ گاؤں کی آبادی میں رہتے ہوئے بھی اب وہ تنہا تھا، اسے صرف اپنے کام سے غرض رہ گئی تھی۔ اگر کہیں لکڑی کا کوئی کام مل جاتا تو وہ جاتا، مزدوری کرتا اور چلا آتا۔ گاؤں کی سڑکوں پر، پہاڑی چائے خانوں میں، ہرے بھرے درختوں کے درمیان، وہ ہمیشہ اکیلا نظر آتا۔ کیونکہ نوجوان اس سے بات کرنا اپنی ہتک سمجھتے تھے، لڑکیاں اس کی طرف دیکھنا عار سمجھتی تھیں، بچے اس کا مضحکہ اڑاتے تھے، اسے دیکھ کر تالیاں بجاتے تھے کیونکہ وہ ایک بزدل تھا، کیونکہ اس نے ڈیما میں لڑنے سے انکار کر دیا تھا کیونکہ......''

بڈھے کی آواز گلوگیر ہوگئی۔ اس نے پانی کا ایک اور گلاس اپنے خشک حلق میں انڈیل لیا۔

''ایک دن جبکہ میں ہنستا کھیلتا چند نوجوانوں کے ساتھ ''گھوم'' کی جانب جا رہا تھا، میں نے دیکھا ریاض اور عذرا دونوں چلے آ رہے ہیں۔ نگار کچھ چلا چلا کر، ہاتھ ہلا ہلا کر کہہ رہی تھی۔ اس کی آواز میں ایک التجا تھی، التجا میں ایک آرزو تھی۔ عمر دھیمی آواز میں جواب دے رہا تھا۔ اس کے جواب میں شاید ایک انکار تھا۔ انکار میں ایک عزیمت تھی۔ ہم لوگ ان کے قریب سے گذر گئے۔ میں نے نگار کو کہتے ہوئے سنا ــــــ 'بزدل کہیں کا!'

''اس کے بعد، اس کے بعد حضور میری تاریک زندگی میں کچھ روشنی نظر آئی، میری ناکام آرزوئیں کامیابی سے قریب تر ہونے لگیں۔ ایک دن اسی ڈیما میں میرا نگار کا سامنا ہو گیا۔ میں نے زبردستی مسکرا کر اس کی خیریت پوچھی، اس نے بھی مسکرا کر جواب دیا اور کسی نامعلوم قوت نے مجھے یہ سمجھا دیا کہ نگار پھر میری طرف مائل ہو چکی ہے۔ ہم دونوں اب اکثر ساتھ نظر آتے۔ یوں تو وہ عموماً خاموش رہتی، اکثر کچھ سوچا کرتی مگر جب کبھی وہ عمر کو دیکھ پاتی اور میں اس کے قریب ہوتا تو میری طرف بے انتہا متوجہ ہو جاتی۔ شاید وہ عمر سے انتقام لے رہی تھی، اپنی محبت کا انتقام، اپنی ــــــ حرکتوں ــــــ کا انتقام!

''پھر ایک دن وہ آیا جس نے ہم دونوں کو ہمیشہ کے لئے ایک دوسرے کا بنا دیا۔

وہ سامنے والی چھوٹی سی پہاڑی جو آج آپ کی نگاہوں کے سامنے چمک رہی ہے، میری سسرال بنی اور کچھ دن وہاں رہنے کے بعد اسے اپنے گھر سے پہاڑی پر لے آیا جہاں آج آپ مجھے دیکھ رہے ہیں۔

''ابھی پورا ایک برس بھی نہ گذرا تھا کہ ہم دونوں کی محبت کی ایک ننھی سی یادگار نگار کی گود میں نظر آئی۔ وہ بہت حسین تھی حضور، بالکل اپنی ماں کی تصویر، ہم اسے حُسنا پکارتے تھے۔''

''پکارتے تھے؟ تو کیا اب وہ نہیں ہے؟'' میرے ساتھی نے جلدی سے پوچھا، اسکے دل میں شاید کوئی خوفناک شبہ گذرا تھا۔

''نہیں حضور! اب وہ نہیں ہے۔ دو برس تک ہم دونوں کو رنگین خواب دکھانے کے بعد ایک دن اس نے ہمیشہ کیلئے اپنی آنکھیں بند کر لیں۔ معمولی بخار تھا حضور، مگر موت کو تو صرف بہانہ چاہئے۔ اگر میری حسنا آج ہوتی تو شاید میں اس قدر جلد بڈھا نہ ہو جاتا۔

''خیر۔'' بڈھے نے اصل پہلو پر آتے ہوئے کہا۔ ''تو ہم دونوں کی شادی ہوگئی۔ اس خبر نے عمر کو بالکل توڑ دیا۔ میں بہت خوش تھا حضور! اگر عمر کی زندگی میں ایک ایسی شئے کو اپنا چکا ہوں جو شاید اسکی تنہا آرزو تھی، اور جسے وہ اپنی جان سے زیادہ قیمتی سمجھتا تھا۔

''عمر اب بھی نظر آتا۔ اکثر سر جھکائے ہوئے، اکثر کسی خیال میں گم، نگاہوں میں حسرتیں، چال میں ناکامی کسی ہوئی۔ کبھی کبھی اپنا سر کا کاندھے پر رکھے ہوئے کہیں جاتا کام کرتا اور چلا آتا۔ نوجوان اب اسے چھیڑتا، کھلونے لا کر دیتا، اس کے ساتھ کھیلتا انہیں بازار لے جاتا۔ گاؤں کی شادی شدہ عورتیں، ان بچوں کی مائیں عمر کو فرشتہ صفت سمجھنے لگی تھیں۔

بڈھا کہتے کہتے رک گیا۔ اس کے چہرے پر وہ بے چینیاں ابھر آئیں جو دل کی کسی گہرائی میں چھپی ہوئی تھیں۔ پیشانی شکن آلود ہوگئی، نگاہوں میں ندامت جھلکنے لگی، آہستہ آہستہ بولا:

''ایک دن نگار کی بڑی بہن مینا نے ہم دونوں کو اپنے یہاں دعوت دی۔ بہت

اصرار کے ساتھ بلایا تھا۔ ہم دونوں نے اس کی دعوت بخوشی منظور کرلی اور وہاں جانے کی تیاریاں کرنے لگے۔ یہاں سے دور، بہت دور۔ وہ جو آپ ایک پہاڑی دیکھ رہے ہیں۔ وہیں مینا کا مکان تھا۔ اب ہے یا نہیں، مجھے نہیں معلوم کیونکہ اس دن کے بعد پھر میں وہاں نہیں گیا۔ چلتے وقت نگار کا دل اپنی لڑکی کے لئے پس وپیش کرنے لگا کہ اسے ساتھ لے جائے یا نہ لے جائے کیونکہ حضور، اس پہاڑی اور اس پہاڑی کے درمیان ایک تنگ وادی پڑتی ہے جس پر سے پہاڑوں کا پانی ہمیشہ گذرتا رہتا ہے، عموماً یہ پانی کمر کمر رہتا ہے اور معمولی گھوڑوں کی پیٹھ پر لوگ اسے پار کرلیتے ہیں۔ لیکن جب کبھی بارش ہو جاتی ہے تو اس کا زور بڑھ جاتا ہے اور اسے پار کرنا ناممکن۔ نگار کو ڈر تھا کہ ایسا نہ ہو کہیں پانی برس جائے اور اس کی ننھی سی جان کو تکلیف ہو۔ آخر یہ فیصلہ کیا گیا کہ لڑکی کو گھر میں چھوڑ دیا جائے ماما کی نگرانی میں۔ یہ ماما حضور، نگار کی والدہ کے وقت کی دایا تھی اور شادی کے بعد نگار ہی کی خدمت میں رہتی تھی۔ بڑی نیک تھی بے چاری، ہم دونوں نے لڑکی کو اس کے حوالے کیا، تاکید کی کہ اسے کوئی تکلیف نہ پہونچے، پھر ایک گھوڑا لیا اور چلے مینا کی دعوت میں۔

''حضور، اب اسے بدقسمتی کہئے یا خدائی عتاب کہ ابھی دعوت ختم بھی نہ ہوئی تھی کہ بادلوں کی گرج ہمارے کانوں میں آنے لگی۔ میری نگار کا چہرہ اتر گیا، میں نے اپنے میزبان سے رخصت چاہی مگر مینا کسی طرح راضی نہ ہوتی تھی۔ کہتی تھی رات وہیں گذار دوں۔ ہمیں حسنا کا خیال ستا رہا تھا اور ہم دونوں واپس ہونے کیلئے اصرار کر رہے تھے۔ آخر مینا نے اس شرط پر ہم دونوں کو رخصت کیا کہ جاتے ہوئے دو بھیڑیں بطور تحفہ اپنے ساتھ لیتے جائیں ورنہ اسے بہت رنج ہوگا۔ ہم عجلت میں تھے حضور۔ بغیر کسی قسم کی دقت کا خیال کئے ہوئے ہم نے بھیڑوں کے گلے کی رسی پکڑی اور اپنی پہاڑی کی جانب چل دیئے۔ ابھی ہم اس پہاڑی سے اترنے بھی نہ پائے تھے کہ ہلکی ہلکی بارش شروع ہوگئی اور ہم نے اپنی رفتار تیز کردی۔ جس گھوڑے پر ہم سوار تھے اسے چابک مارنا شروع کردیا، آگے آگے گھوڑا اور پیچھے پیچھے دونوں بھیڑیں بھاگنے لگیں، مگر قدرت ہمیں سبق دینا چاہتی تھی، اسے منظور نہ

تھا کہ ہم آسانی سے گذر جائیں۔ پانی اب تک کم تھا مگر دم بدم بڑھ رہا تھا۔ ہمارے حواس جواب دے چلے تھے، قبل اس کے کہ ہم بیچ وادی میں پہونچیں، ایک خوفناک گرج نے سامنے کی پہاڑی کو روشن کر دیا۔ کہیں بجلی گری تھی شاید۔ پھر تاریکی چھا گئی، ہمارا گھوڑا ہنہنا کر کھڑا ہو گیا۔ وہ چابک پر چابک کھا رہا تھا مگر ہلنے کا نام نہ لیتا تھا، پانی بڑھ رہا تھا، بڑھتا آ رہا تھا، یاس کے بادل تھے، ناامیدیاں گھیرے ہوئے تھیں، ہر جانب موت ہی موت نظر آ رہی تھی۔ نگار رونے لگی۔ اس نے کہا کہ شاید اب وہ اپنی لڑکی کو نہ دیکھ سکے گی۔ اس بے بسی میں میرے لبوں پر خدا کا نام آ گیا، خدا جو ہر جگہ موجود ہے، خدا جسے ہم اپنے عیش کے لمحوں میں بھول جاتے ہیں، خدا جو جگمگاتا ہے ان پہاڑوں کی چوٹیوں میں، گاتا ہے ان گرنے والے آبشاروں میں، جو تاریکی میں ہنستا ہے، جو بادلوں میں مسکراتا ہے، جو ہنسنا اور مسکرانا جانتا ہے۔ مجھے یاد آ گیا اور میں نے زندگی میں پہلی بار اس کے آگے اپنی جانوں کے لئے التجا کی۔ اس کے آگے گڑگڑایا، میں جو ہر ظاہر و موجود کو ٹھکرانے کے لئے آمادہ رہتا تھا، ایک ہستی نامعلوم، ایک حقیقت غائب کے آگے بچوں کی مانند رو رہا تھا! میری التجائیں شاید ابھی ختم بھی نہ ہوئی تھیں کہ دونوں بھیڑوں نے چلانا شروع کیا، گلا پھاڑ پھاڑ کر، بے تحاشا، وہ طوفان کے زوردار پانی کے چڑھاؤ سے ڈر رہی تھیں۔ مجھے غصہ آ گیا، جی میں آیا کہ ان دونوں کو اپنے چاقو سے وہیں ڈھیر کر دوں، مگر مجھے معلوم نہ تھا کہ خدائے عظیم کس کس طرح اپنے بے کس بندوں کی مدد کرتا ہے۔ میں اس کے غیر محسوس و پوشیدہ طریقوں سے ناآشنا تھا، ہر گنہگار ناآشنا ہوتا ہے۔ حضور، اور میں تو سرتاپا گناہ تھا۔ چند ہی لمحے گذرے ہوں گے کہ میں نے پانی میں شپاشپ کی آواز سنی، میں نے دیکھا کوئی میری جانب بڑی تیزی چلا آ رہا ہے۔ پھر آنے والا قریب آ گیا اور بڑی عجلت کے ساتھ حکم دیا۔ ”تم دونوں جلد اس پر سوار ہو جاؤ ورنہ پانی اور بڑھ جائے گا!“

”یہ عمر تھا حضور، عمر اپنے دریائی گھوڑے پر سوار تھا، یہ عمر تھا جس کا میں دشمن تھا، عمر جس کی نگار کو میں نے چھین لیا تھا، عمر جس نے ڈیما میں لڑنے سے انکار کر دیا تھا۔۔۔۔۔۔

''حضور، اس نے آتے ہی نگار کو اٹھایا اور اپنے گھوڑے پر سوار کر دیا اور قبل اس کے کہ میرے منہ سے کوئی لفظ نکلتا اس نے مجھے حکم دیا —— ''جاوید! جلد سوار ہو جاؤ۔ شکریہ ادا کرنے کا موقع نہیں ہے۔ میں نے سنا تھا کہ تم دونوں وادی پار کر گئے، جب تمہیں دیر ہوئی تو مجھے شک ہوا کہ کہیں پانی بڑھ نہ گیا ہو۔ مجھے خیال تھا، میں ڈھونڈنے چلا، قریب پہنچ کر میں نے بھیڑوں کے چلانے کی آواز سنی اور سمجھا کہ تم اس طرف ہو۔ لو، سوار ہو جاؤ، میرا خیال نہ کرو میں تمہارے گھوڑے پر آ جاؤں گا، میں تیر بھی سکتا ہوں، اس کے علاوہ تم نگار کے شوہر ہو، ایک معصوم لڑکی کے باپ ہو، تمہیں زندہ رہنا چاہئے، میرا کوئی نہیں ہے، جلدی کرو۔

''حضور! اس وقت بھی میری خودغرضی مجھ پر غالب آ گئی۔ میں جلدی سے گھوڑے پر سوار ہو گیا بغیر اس کی جان کا خیال کیے ہوئے۔ میں نے نگار کو کہتے سنا۔ خدا تمہیں ہمیشہ خوش رکھے عمر! تم نے آج میری بچی کو یتیم ہونے سے بچا لیا!

گھوڑا تیرنے لگا اور ہم دونوں بہت جلد کنارے پہونچ گئے، صحیح وسالم۔ دونوں بھیڑوں کو اپنے پیچھے خدا کے رحم پر چھوڑتے ہوئے۔ کنارے پہونچ کر ہم دونوں اپنی پوری قوت سے عمر کو آواز دینے لگے۔ اس کا نام لے لے کر پکارنے لگے، مگر ہماری آوازیں پانی کے شور میں گم ہو گئیں۔ ہمیں کوئی جواب نہ ملا، سوائے بادلوں کی گرج کے، سوائے پانی کی سائیں سائیں کے اور ہمارے دل میں ایک خوفناک شبہہ گذرا، کہیں عمر ڈوب نہ گیا ہو۔ اس خیال نے نگار کو بے تاب کر دیا، وہ پھٹ پڑی اور چلائی۔ عمر جواب دو، دیکھو تمہاری نگار تمہیں پکار رہی ہے! پھر اس نے میرے کاندھے پر سر رکھ دیا، وہ سسکیاں لے رہی تھی۔''

میرے ساتھی نے بے چینی سے ایک انگڑائی لی، پھر داستان میں محو ہو گیا۔

اس واقعہ کے دو دن بعد خبر ملی کہ وادی میں ایک مرے ہوئے گھوڑے اور ایک آدمی کی لاش پانی کے اوپر ابھر آئی ہے۔ ہم دونوں سنتے ہی دوڑے، عمر کو پہچاننا مشکل تھا مگر نگار دیکھتے ہی چلا اٹھی۔ یہ عمر ہے، یہ عمر ہے۔ لاش کنارے لائی گئی، دفن کفن کا انتظام ہونے

لگا۔ حضور، اس دن کے بعد پھر میں نے نگار کی نگاہوں میں آنسو نہیں دیکھے۔ لاش پائی گئی، پورا گاؤں ساتھ تھا۔ بچے، جوان، بوڑھے، سب کہہ رہے تھے کہ یہ ایک بہادر انسان کا جنازہ ہے جس نے دوسروں کی زندگی کے لئے اپنی زندگی پیش کی ہے۔ سب کے سب پہاڑی قبرستان کی جانب جارہے تھے، سوائے نگار کے جس نے جانے سے انکار کر دیا تھا یہ کہہ کر کہ وہ اپنے گنہگار ہاتھوں سے ریاض کی قبر نہ چھوئے گی! حضور اسی پہاڑی کے دامن میں وہ قبرستان ہے جہاں عمر اور نگار دونوں آرام کی نیند سو رہے ہیں!

''عمر اور نگار؟ تو کیا نگار بھی ____''

''جی ہاں حضور'' بڈھے نے کہا۔ اس واقعہ کے بعد وہ زیادہ دنوں تک زندہ نہ رہ سکی۔ وہ اب اکثر چپ چاپ رہتی، کچھ سونچا کرتی، شاید عمر کی باتیں، شاید عمر ہی کے خیال میں رہتی۔ میں بھی اس سے نہ بولتا، جانتا تھا کہ دنیا کی کوئی قوت اب اس سے عمر کا خیال نہیں ہٹا سکتی۔ پھر اسے بخار آنے لگا، ایک دن اسی حالت میں مجھ سے کہنے لگی کہ شاید اب میں نہ بچوں گی۔ تمہیں مجھ سے محبت ہے میں جانتی ہوں۔ اسی محبت کا واسطہ دے کر کہتی ہوں کہ میری ایک آرزو ہے، اسے پورا کر دینا اور وہ یہ کہ مجھے وہیں دفن کرنا جہاں عمر سو رہا ہے اور اگرچہ میں نے اسے اس کی زندگی کا یقین دلایا مگر مجھے معلوم تھا کہ بہت جلد اس کی وہ آرزو پوری ہونے والی ہے۔ حضور، ایک دن اسی بخار میں میری نگاہوں کے سامنے میری ہی آغوش میں اس نے ہمیشہ کے لئے اپنی آنکھیں بند کر لیں۔ مجھ سے ہمیشہ کے لئے جدا ہوگئی اور مجھے اس دنیا میں صرف اس لئے چھوڑ گئی کہ زمانہ گذشتہ کی دھندلی تصویروں کو دیکھتا رہوں، دیکھتا رہوں اور روتا رہوں ____''

اور میں نے دیکھا کہ اس کی ضعیف آنکھوں سے آنسوؤں کے دو قطرے مرجھائے ہوئے گالوں پر لڑھکتے ہوئے آئے اور اس کی برف مثال طویل داڑھی میں جذب ہوگئے۔

''حضور!'' اس نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔ ''مجھے میرے گناہوں کی سزا مل

رہی ہے، میرا ضمیر مجھے برابر سزا دیتا رہتا ہے۔ اکثر جب اس قہوہ خانہ میں کسی کو تنہا پاتا ہوں تو میری طبیعت بے چین ہو جاتی ہے۔ مجھے محسوس ہوتا ہے کہ ان پہاڑیوں کا پورا بوجھ میری چھاتی پر رکھا ہوا ہے۔ پھر میں اسے اپنی داستان سناتا ہوں، اپنی زندگی کی یہی داستان جو ابھی آپ نے سنی۔ سننے والا سنتا رہتا ہے اور میری داستان ختم ہو جاتی ہے۔ پھر مجھے محسوس ہوتا ہے کہ میری چھاتی کا بوجھ اتر گیا، آہ! اعترافِ گناہ کے بعد ضمیر کس قدر مطمئن ہو جاتا ہے حضور! میں آپ کا بہت مشکور ہوں کہ آپ نے وقت ضائع کر کے مجھے اعتراف گناہ کا موقعہ دیا، امید ہے کہ حضور پھر تشریف لائیں گے۔

بڈھا خاموش ہو گیا، میں نے اپنے ساتھی کی طرف دیکھا اور چونک پڑا۔

''ارے تم رو رہی ہو؟'' میں نے کہا۔

اس نے میرے کاندھے پر سر رکھ دیا اور سسکیاں لینے لگی۔

مطبوعہ سالنامہ خیام، لاہور، اکتوبر 1940ء

گھر سے دور ______ !

اتوار، اتوار انہیں چھٹی ملا کرتی تھی۔ اور چھٹی ملتے ہی وہ دونوں گھومنے نکل جاتے۔ وہ چلتے رہتے، یہاں تک کہ غریب مزدوروں کی جھونپڑیوں کا سلسلہ ختم ہو جاتا، پل کے پار، ہرے بھرے جنگل کے قریب پہونچ کر وہ اپنی رفتار کم کر دیتے۔

دونوں دبلے پتلے تھے۔ سروں پر میلی کچیلی ٹوپیاں، پیجامہ اور قیص پر تیل کے سیاہ دھبے، پیروں میں پھٹے پرانے جوتے، خاموش و کم گفتار، اپنے خیالوں میں گم دونوں چلتے رہتے۔ راہ میں بہت کم گفتگو ہوتی کیونکہ سون ندی کے کنارے، پل سے اتر کر، درختوں سے گھری ہوئی تنہائی میں ایک جگہ ایسی بھی تھی جو انہیں اپنے گھروں کی یاد دلاتی اور وہ وہیں پہنچ کر خوش ہوتے۔ یہی ان کی سیر تھی۔

اکثر، سون ندی کے کنارے جبکہ پانی کی روانی زیادہ ہوتی تو وہ کھڑے کھڑے خیالی دنیا میں چکر لگایا کرتے۔ ان کی نگاہیں کسی ایک مرکز پر جم جاتیں اور اسی خیال میں وہ اپنے گھروں کا خواب دیکھنے لگتے ____ بوڑھے باپ، ماں، چھوٹی بہن، گاؤں کے وہ نوجوان جن کے ساتھ بچپن کھیل کر گذارا تھا، سبھی یاد آتے۔ انہیں گھر چھوڑے ہوئے دو برس ہو چکے تھے۔ وہ شکر کے مل کے مزدور تھے۔

انہوں نے اپنی مرضی سے گھر نہیں چھوڑا تھا بلکہ قسمت نے مجبور کر دیا تھا۔ متواتر تین چار سال سے فصل خراب ہو رہی تھی۔ بے چارہ بڈھا لگان دینے سے معذور تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ایک دن سر عام اس کی زمین کا نیلام بول دیا گیا۔ دونوں بھائیوں کو غیرت آئی اور زمین واپس لینے کے لئے وہ قسمت کا نام لے کر چل نکلے کہ کچھ پونجی ہو تو آرزو پوری ہو۔

شکر مل میں پہلے تو معمولی مزدوری کرنا پڑی۔ پھر کام دیکھ کر افسر نے سو سو پر سردار کر دیا۔ آمدنی تو اب غنیمت تھی مگر فرصت کا نام نہ تھا کہ کبھی جائیں اور گھر ہو آئیں۔ ایک

بار دونوں نے بڑی التجا کی، بڑی خوشامد کی مگر آخر ٹس سے مس نہ ہوا۔ کہا کہ کام چھوڑ دگے تو نوکری سے ہاتھ دھونا پڑے گا!

اس لئے ہر اتوار کو، تھوڑی دیر کی خوشی کیلیے وہ جنگلوں کو نکل جاتے، دن بھر یا دن کا بیشتر حصہ وہیں گذارتے اور اس طرح وہ اپنی چھٹی کا دن منالیا کرتے۔

راہ میں وہ کسی نانبائی کے یہاں سے کچھ روٹیاں، تھوڑی سی بھنی ہوئی ترکاری، کبھی کبھی گوشت خرید لیتے اور سہ پہر کے قریب جب ان کو بھوک لگتی تو کھاتے۔ یہی ان کی شام کا ناشتہ ہوتا اور رات کا کھانا بھی! کسی دن جب ان کی مزدوری اچھی ہو جاتی تو وہ کچھ مٹھائی بھی خرید لیتے تاکہ کھانے کے بعد کھائیں۔ گوشت کے ساتھ نیبو اور ہری مرچیں بھی خریدتے تاکہ گوشت چٹپٹا اور مزیدار معلوم ہو۔ گھروں سے دور، باپ ماں کی محبت سے بچھڑ کر، ہر اتوار کو گھر کی یاد سے وہ اپنے دل خوش کرلیا کرتے تھے۔

دوپہر کے قریب ان کی نگاہیں اکثر سامنے والے گاؤں کی طرف اٹھ جاتیں۔ کیونکہ یہی وقت ہوتا تھا اس لڑکی کے آنے کا۔ ہر اتوار کو وہ ان دونوں کے سامنے سے گذرتی اس گائے کو دوہنے کے لئے، جو اسی جنگل میں چرنے کو بھیجی جاتی تھی۔

پھر ان کی نگاہیں اسے آتا ہوا دیکھ لیتیں۔ وہ بہت مسرور ہوتے سورج کی شوخ کرنوں کو اس کے چہرے پر نچھاور ہوتے دیکھ کر۔ اس کی پیتل کی بالٹی، اس کا سرخ دھاری دار لہنگا اور سبز انگیا، اس کا وہ ڈوپٹہ جسے دودھ دوہتے وقت وہ گائے کے پچھلے پیروں سے باندھ دیتی۔ دونوں دور ہی سے یہ سب چیزیں پہچان لیتے۔ اسے دیکھ کر وہ دونوں خوش ہو جاتے لیکن وہ کیوں خوش ہوتے تھے۔ یہ انہیں بھی معلوم نہ تھا۔ وہ تو بس اسے دیکھتے اور خوش ہوتے۔

لیکن انہوں نے کبھی اسکے بارے میں گفتگو نہیں کی۔

لڑکی جوان تھی، کشیدہ قامت، ابھرا ہوا گداز جسم، چہرے پر دھوپ کا اثر مگر رخسار

دیہاتی آب وہوا اور محنت کی وجہ سے گلابی، گویا خون پھوٹا پڑتا تھا۔

وہ روزانہ اپنی گائے دوہنے کو اس جنگل میں آتی کیونکہ وہیں اس کی گائے چرا کرتی تھی۔ اور ہر اتوار کو وہ ان دونوں بھائیوں کو دیکھتی، اکثر ایک ہی طرح بیٹھتے ہوئے، اکثر ایک ہی طرح کھاتے ہوئے پاتی ـــــ اسی طرح بہت سے اتوار گذر چکے تھے۔ اسے تعجب تھا کہ ہر ہفتہ اسے دیکھنے کے باوجود ان دونوں میں کسی نے اسے مخاطب نہیں کیا۔ کیسے نوجوان تھے وہ دونوں!

آخر ایک اتوار کو جب وہ دونوں حسب معمول ایک بڑے پتھر پر بیٹھے ہوئے سون ندی کی روانی دیکھ رہے تھے، وہ ان کے قریب سے گذرتے ہوئے بولی:

''تم دونوں یہاں کیا کرتے ہو؟''

اس اچانک تفتیش سے دونوں کسی قدر گھبرا گئے۔ سوچنے لگے کہ کیا جواب دیں۔ بڑا بھائی جو کچھ زیادہ دلیر تھا، بولا:

''چھٹی ملتی ہے تو ادھر ہی نکل آتے ہیں ہم دونوں!''

اور بس۔ بات چیت ختم۔ وہ اپنی گائے دوہنے چلی اور یہ پتھر پر بیٹھے رہ گئے۔

لیکن دوسرے اتوار کو جب وہ اس جنگل سے گذری تو انہیں دیکھ کر مسکرائی۔ بالکل اس عورت کی مانند جس نے کسی مرد کے شرمیلے پن کو سمجھ لیا ہو۔ پھر بولی:

''کیا کر رہے ہو تم دونوں؟ کیا گھاس کو بڑھتے دیکھ رہے ہو؟''

بڑا بھائی خوش ہو گیا، بولا:

''شاید۔!''

وہ پھر بولی:

''تیزی سے بڑھتی نہیں معلوم ہوتی نا؟''

وہ ہنس پڑا۔ ''نہیں!''

وہ بھی ہنس دی۔

پھر وہ چلی دودھ دوہنے اور یہ دونوں ادھر ادھر کی باتیں کرتے رہے۔ تھوڑی دیر بعد روٹی اور ترکاری نکالی گئی اور دونوں کھانے لگے۔ اور ابھی دونوں کھا ہی رہے تھے کہ وہ واپس ہوئی۔ بالٹی میں دودھ لئے ہوئے، ان کے قریب پہونچ کر بولی:

''کیوں دودھ پیوگے؟ یہ تمہیں گھر کی یاد دلائے گا۔''

اس نے نادانستہ دونوں کی دکھتی ہوئی رگ کو چھولیا تھا۔ دونوں کے چہروں پر اچانک یاس کی ایک خفیف سی جھلک بیدار ہوگئی۔ انہیں دراصل گھر یاد آ گیا تھا!

پھر بغیر دوبارہ پوچھے ہوئے اس نے ان کے پیالے میں دودھ بھر دیا۔

بڑے بھائی نے پیالہ اٹھایا اور آہستہ آہستہ پینے لگا، ڈرتے ہوئے کہ کہیں وہ اپنے بھائی کا حصہ بھی نہ پی لے، پھر اس نے پیالہ اپنے چھوٹے بھائی کی طرف بڑھا دیا۔

وہ دونوں کے سامنے کھڑی رہی۔ ایک ہاتھ کولہے پر رکھے، بالٹی پیروں پر، مزہ لیتی ہوئی اس مسرت سے جو اس نے ان دونوں کو دی تھی۔ وہ بولی:

''تم نے اپنا نام تو بتایا ہی نہیں؟''

میرا نام محمد دین ہے!'' بڑا بھائی اس طرح بول اٹھا گویا صرف اسی سے پوچھا گیا تھا۔

چھوٹا بھائی خاموش رہا۔

''اور تمہارا نام؟'' اس نے دوسرے سے پوچھا۔

''احمد دین۔''

''اچھا تو اب دوسرے اتوار کو۔'' اس نے بالٹی اٹھائی اور چل دی۔

دونوں کی نگاہیں کچھ دور تک اس کا تعاقب کرتی رہیں۔

اتوار یوں ہی گذرتے رہے اور وہ ہر اتوار کو ان سے ملتی اور انہیں دودھ دیتی رہی۔

ایک اتوار کو جنگل کی جانب جاتے ہوئے چھوٹے بھائی نے تجویز پیش کی کہ اس کے لئے بھی کوئی تحفہ لے جانا چاہئے۔ بڑے بھائی نے بھی اس رائے کو پسند کیا اور دونوں

غور کرنے لگے کہ کونسی شے مناسب ہوگی۔

بڑے کا خیال تھا کہ ابکی میلے سے اس کے لئے لکڑی کا ایک سنگار دان خرید لیا جائے تو کیا برا ہو؟ مگر چھوٹے بھائی کی رائے میں یہ بات کچھ جچی نہیں۔ اس کا خیال تھا کہ کوئی ایسی شے اسے نہیں دینا چاہئے جو وہ گھر لے جائے کیونکہ گھر والوں کو اس سے شک کا اندیشہ ہے۔ ممکن ہے کوئی پوچھ بیٹھے کہ کس نے دیا؟ کہاں سے لائی؟ تو؟ بہتر یہی ہے کہ کوئی مزیدار کھانے کی چیز اسے دی جائے تا کہ جب وہ ہمیں دودھ دے تو ہم بھی وہ چیز اسے دیدیں۔ آخر چھنکو حلوائی کی دکان کے کیوڑے میں بسے ہوئے پیڑوں پر فیصلہ ختم ہو گیا۔

چنانچہ انہوں نے چار آنے کے پیڑے خریدے اور پہونچے اسی جنگل میں۔ دونوں بے چینی سے انتظار کرنے لگے۔ یکا یک چھوٹا بھائی بولا:

"دیکھو، وہ آرہی ہے!"

"ہاں، آرہی ہے وہ!"

وہ ان کے قریب پہونچ گئی اور بولی۔

"کیا ہو رہا ہے آج۔؟"

پھر باتیں شروع ہو گئیں۔ دیہاتی زندگی کی سیدھی سادی باتیں۔ آب وہوا کی تبدیلی۔ فصل کی خوبی۔ مل کے مالکوں کا انداز۔ غلہ کی گرانی۔ مہاجن کا سود۔ معاشیات کے تمام اصول زیر بحث آرہے تھے۔ گفتگو ہوتی رہی۔

دونوں میں سے کسی کی ہمت نہ ہوئی کہ پیڑے پیش کرتے۔ دونوں بے چین تھے۔ آخر کس طرح کہا جائے کہ وہ دونوں اس کے لئے پیڑے لائے ہیں؟

آخر بڑے بھائی نے ہمت کی اور بولا:

"ہم تمہارے لئے ایک چیز لائے ہیں!"

"دکھاؤ کیا لائے ہو؟ اس نے جواب دیا۔

احمد دین کا چہرہ سرخ ہو گیا۔ اس کی جیب میں پیڑے تھے۔ کپکپاتے ہوئے

ہاتھوں سے اس نے اپنی جیب سے پیڑے نکالے اور لڑکی کے سامنے رکھ دیئے۔ وہ اس کے ہاتھ میں نہ دے سکا، وہ بہت شرمیلا تھا۔

وہ پیڑے کھانے لگی۔

دن یونہی گذرتے رہے۔

محمد دین نے اس بار اپنی تنخواہ سے دو قمیص اور دو نئے پائجامے بنائے۔ اس کے بال اکثر الجھے رہتے تھے مگر اب وہ انہیں سنوارنے لگا تھا۔ کبھی کبھی تیل بھی لگا لیتا۔

احمد دین میں کوئی تبدیلی نہیں ہوئی تھی۔

ایک دن دونوں اسی جنگل میں بیٹھے ہوئے تھے۔ آج بجائے روٹیوں کے دونوں تین تین بھٹے اپنے ساتھ لائے تھے۔ پھر انہوں نے سوکھی ہوئی پتیاں جمع کیں، آگ لگائی اور بھٹے بھون لئے۔ احمد دین دانے چباتا ہوا بولا:

''اگر زمین ہوتی تو ابکی فصل اچھی ہوتی بھیا!''

''کل تنہو کہار گاؤں سے آیا ہے۔'' احمد دین بولا۔ ''وہ بھی یہی کہہ رہا تھا۔ ابکی پانی خوب ہوا ہے وہاں!''

دونوں خاموش ہو گئے، کیونکہ دونوں کو کچھ یاد آ گیا تھا۔ اسی تنہو کہار نے ان دونوں کی ماں کی بیماری کی بھی تو خبر دی تھی؟ دونوں سوچنے لگے۔ گھر کا آرام، باپ ماں کی شفقت، دوست یار، سب ایک ایک کر کے یاد آنے لگے۔

احمد دین نے ایک ٹھنڈی سانس لی اور بولا:

''اس بار جو ملے گا گھر بھیج دوں گا۔''

محمد دین کے چہرے پر ندامت جھلکنے لگی:

''بھیجتا تو میں بھی مگر ابکی کچھ کپڑے بنوا لئے ہیں۔''

''تو کیا ہوا۔ میں ہی بھیج دوں گا۔'' احمد نے کہا۔

محمد سر جھکائے سوچتا رہا۔

ایک دن ایک عجیب واقعہ پیش آیا۔ منگل کا دن تھا۔ محمد دین نے اپنے افسر سے شام کے بعد چند گھنٹوں کی چھٹی مانگی اور دس بجے رات تک غائب رہا۔

احمد دین تشویش و پریشانی میں سوچتا رہا کہ آخر اسکے بھائی کے چھٹی لینے کا سبب کیا تھا؟

پھر اس جمعہ کو محمد دین نے اپنے ایک دوست سے کچھ روپیہ قرض لئے اور اسی دن کی طرح پھر چند گھنٹوں کی فرصت لے کر رات گئے تک غائب رہا۔

اتوار کو جب وہ دونوں حسب معمول جنگل کی جانب جا رہے تھے، محمد دین کچھ پریشان، کچھ عجیب، کچھ بدلا ہوا سا معلوم ہو رہا تھا۔ احمد دین کچھ سمجھ نہ سکا۔ چند دھندلے شک، چند مبہم خیال اس کے دماغ میں لیکن وہ سمجھ نہ سکا کہ وہ کیا تھے، کس لئے تھے۔

دونوں وہیں پہونچے جہاں ہمیشہ بیٹھا کرتے تھے۔ تھوڑی دیر میں انہوں نے روٹیاں نکالیں اور کھانے لگے۔ بھوک کسی کو بھی نہیں تھی۔

کچھ دیر بعد لڑکی نمودار ہوئی، ایک ہاتھ میں پیتل کی بالٹی لئے ہوئے۔ محمد دین دیکھتے ہی کھڑا ہو گیا۔ وہ قریب آئی اور بولی:

''میرا ایک کام کر دو گے؟''

''ضرور کروں گا!'' محمد دین نے جواب دیا۔ ''کیا کام ہے بولو!''

''تھوڑی سی سوکھی لکڑیاں توڑ دو!''

''بس یہی کام ہے؟ اچھا توڑ دوں گا۔''

''تو پھر چلو توڑ دو ورنہ مجھے دیر ہو جائے گی۔ آج گھر میں کام ہے بہت۔''

وہ آگے بڑھی، محمد دین پیچھے پیچھے ہولیا۔ احمد دین کچھ سمجھا، کچھ نہ سمجھ سکا۔ خاموش بیٹھا انہیں جاتے ہوئے دیکھتا رہا۔ پھر اس نے دیکھا کہ کچھ دور جا کر محمد نے لڑکی کا ہاتھ تھام

لیا اور دونوں ساتھ چلنے لگے۔ ساتھ چلتے رہے۔ جھاڑیوں کے قریب۔ درختوں کی اوٹ میں۔ محمد کا سر جھکا۔ لڑکی کسی انتظار میں کھڑی ہو گئی۔ محمد کا سر جھکتا رہا اور پھر لڑکی کے چہرے سے پیوست ہو گیا۔ وہ آگے بڑھتے رہے۔ درختوں میں چھپ گئے۔ جنگل میں غائب ہو گئے۔ احمد کو حیرت تھی۔ وہ حیرت سے دیکھتا رہا۔ وہ کچھ سمجھ نہ سکا اور پھر یکایک وہ سب کچھ سمجھ گیا۔ بھائی کے مزاج میں تبدیلی نئی قمیض اور پائجامے، راتوں کی فرصتیں، سب اس کی سمجھ میں آ گئیں۔ اس کے دل میں ایک ٹیس سی اٹھی۔ دل کی گہرائیوں میں دبے ہوئے جذبے جنہیں وہ اب تک نہ سمجھ سکا تھا اب یکایک ابھر آئے تھے۔ اور اسے بے تاب کئے ڈالتے تھے۔ اس کی بھی کوئی تمنا تھی جو آج مٹ گئی، کوئی حسرت تھی جو پامال ہو گئی، سکون تھا، فنا ہو گیا۔ اور زندگی میں پہلی بار اسے احساس ہوا کہ اسے بھی کسی سے محبت تھی، نادانستہ و نامعلوم محبت!

پھر اسی بربادیٔ تمنا میں، اس ہجوم حسرت میں، اسے اپنا گھر یاد آیا۔ گھر کے ساتھ ہی اپنی ماں یاد آئی، بیمار بچھڑی ہوئی ماں۔ وہ تسلی ڈھونڈنے لگا، اس کی کوئی چیز کھو گئی تھی اور وہ بے چین تھا اسے پانے کے لئے۔ اگر ماں کو معلوم ہو جائے تو کیا وہ تسلی نہ دیتی؟ کیا وہ چیز نہ ڈھونڈ دیتی جس کے لئے اس کا بچہ بیتاب تھا؟ ماں اپنے بچے کے لئے کیا نہیں کرتی؟ وہ اپنے بچے کی ہر عمر میں ماں ہوتی ہے ——— وہ کھسیانہ ہو گیا، اس کا دل بھر آیا، بالکل اس بچے کی مانند جو اپنی ماں کی آغوش سے دور غیروں کے گھر میں ذرا ذرا سی بات پر ماں کو یاد کرتا ہے ——— ماں ——— ماں۔ آہ! اس کی ماں اس سے دور تھی۔ وہ گھر سے دور تھا، وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔

وہ دونوں آتے ہوئے دکھائی دیئے۔ محمد کے ہاتھ میں ٹوٹی ہوئی لکڑیاں تھیں، لڑکی کے ہاتھ میں دودھ کی بالٹی ——— احمد نے جلدی سے اپنے آنسو پونچھ ڈالے۔

وہ دونوں آئے اور بیٹھ گئے۔ لڑکی نے روز کی طرح دونوں کے پیالے میں تھوڑا سا دودھ انڈیل دیا۔ احمد نے دودھ پیا۔ آج اس سے کسی نے زیادہ بات چیت نہیں کی۔ وہ

چپ بیٹھا رہا۔ سوچتا رہا۔ محمد دین لڑکی سے ہنس ہنس کر باتیں کر رہا تھا۔ وہ ہنس ہنس کر جواب دے رہی تھی۔ دونوں کو خیال بھی نہ تھا کہ ان کی مسرت میں آج کسی کے ٹوٹے ہوئے دل کی حسرت بھی شامل ہے!

کچھ دیر بعد لڑکی اٹھی اور دوسرے اتوار کا وعدہ کر کے اپنے گھر چل دی۔

پل پر پہنچ کر احمد یکا یک رک گیا۔ سورج ان کی پشت پر غروب ہونے کو تھا۔ وہ دیر تک سرخ بادلوں کو دیکھتا رہا۔ پھر یکا یک وہ پل کی سلاخوں پر جھکا، جھکتا گیا گویا پل کے نیچے کسی شے سے دلچسپی لے رہا ہے۔ محمد دین نے پوچھا۔ ''کیا دیکھ رہے ہو نیچے؟'' مگر اس کے منہ سے یہ الفاظ نکلے ہی تھے کہ احمد سر کے بل پل کے نیچے جا رہا۔ سون کی روانی میں ایک لمحہ کے لئے تلاطم برپا ہوا، میلی قمیض ایک بار پھر ابھری اور ہمیشہ کے لئے غائب ہو گئی۔ ندی بہتی رہی۔

محمد بوکھلا گیا۔ کچھ سمجھ نہ سکا۔ وہ دوڑا، بے تحاشہ، چیختا ہوا ــــــ ''ارے دوڑو، احمد پانی میں گر پڑا ہے، اسے کوئی بچاؤ، نہیں تو ڈوب جائے گا۔''

کاش، اسے معلوم ہوتا!

☆☆☆

مطبوعہ: رسالہ عالمگیر، لاہور نومبر 1940ء

وہ بائیس دن ــــــــ !

دارجلنگ سے جب طبیعت اکتا گئی تو اس سال شیلانگ کا ارادہ کیا۔ صوبۂ آسام کا سب سے خوبصورت شہر، سب سے خوبصورت پہاڑوں پر آباد ہے۔ بے پروا طبیعت نے چونکہ کوئی خاص انتظام نہیں کیا تھا اس لئے وہاں پہونچ کر رہائش کے لئے رات کے ساڑھے گیارہ بجے تک مارے مارے پھرنا پڑا۔ خدا خدا کر کے ایک چھوٹی سی پہاڑی پر ایک چھوٹا سا ہوٹل ملا جس کا نام تھا ''گرانڈ ہوٹل''۔ پرانی کہاوت یاد آ گئی۔ ''نام بڑا اور درشن چھوٹا!'' ہوٹل تھا صاف ستھرا۔ اسی میں ایک چھوٹا سا کمرہ مجھے بھی نصیب ہوا۔ کمرے میں ایک مسہری تھی۔ ایک سنگاردان جس کے آئینہ کا ایک کونہ ٹوٹا ہوا تھا۔ بید کی ایک گول میز تھی جس پر ایک خاندان شاید مہینوں سے پڑا تھا۔ جنوبی دروازے کے قریب کپڑا اٹانگنے کی ایک کھونٹی تھی۔ یہ تھا فرنیچر۔ یوں ہوٹل میں ساڑھے آٹھ کمرے تھے اور ان میں چار مسافر۔ میں، میرا شریک سفر، ایک بنگالی اور ایک انگلوانڈین۔

میں نے کبھی سنگاردان نہیں کھولا۔ اس کے استعمال کی نوبت ہی نہیں آئی۔ لیکن ایک دن میں نے یونہی اس کی ایک دراز گھسیٹ لی۔ اندر کچھ نہ تھا۔ سوائے خاک اور ایک پتلی سی نیلی کاپی کے۔ جیسی عموماً بازاروں میں دو دو پیسے میں بکتی ہے۔ خاک نے نیلے سرورق پر ہلکی سی سیاہی پھیر دی تھی۔ معلوم ہوتا تھا برس ڈیڑھ برس قبل کوئی مسافر عجلت میں بھول گیا ہے۔ کاپی کو کھولا تو آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں۔ یہ کسی کی ڈائری تھی، کسی فلسفی طالب علم کی ڈائری۔ 4/مئی سے 23/مئی تک برابر لکھی ہوئی تھی۔ شاید یہی مصنف کا اولین زمانۂ قیام تھا۔ پھر دو تاریخیں اور تھیں جب وہ دوبارہ شیلانگ آیا اور آتے ہی۔ خدا معلوم کیا ہوا یا کہاں چلا گیا کیوں کہ اس کے بعد ڈائری خاموش ہے۔ بہر کیف، یہ بائیس دن آپ کے سامنے ہیں:ــــــ

4/مئی ـــــ شیلانگ جا رہا ہوں، بادلوں کی دنیا میں ۔شاید وہاں کچھ سکون مل جائے۔طبیعت بہت گھبرا رہی ہے، خدا معلوم کیا ہونے والا ہے۔

اسٹیشن تک اماں اور بابا آئے اور پھر گاڑی چھوٹ گئی۔

گاڑی چلی جارہی ہے۔ ہر قسم کے آدمی سوار ہیں۔ مسافروں میں خدا معلوم کتنے وہ ہوں گے جو کسی خوشی کی تقریب میں جارہے ہوں گے۔شاید کسی کی شادی میں، کسی اور تیج تہوار کی محفل میں۔ کتنے وہ ہوں گے جو کسی تعزیت میں جارہے ہوں گے۔شاید کسی کو تسلی دینے کے لئے، شاید خود تسلی پانے کے لئے۔ کسی کو نہیں معلوم کیا ہونے والا ہے۔گاڑی کو اس سے بحث نہیں۔وہ چلی جارہی ہے۔اپنے پیچھے گاؤں، دیہات، شہر چھوڑتی ہوئی۔ اسے خود بھی نہیں معلوم کہ اس کی منزل کہاں ہے۔ اندر ڈبے میں دو آدمی اونگھ رہے ہیں۔باہر، درخت، کھیت بھاگے جارہے ہیں۔ایک بیل کھیتوں میں دوڑ رہا ہے۔

5/مئی ـــــ گاڑی چھ بجے امین گاؤں پہونچی۔ جہاں سے اسٹیمر پر سوار ہوا اور ''پانڈو'' پہونچا۔معلوم ہوا کہ ''کامروپ'' جہاں کا جادو بہت مشہور ہے، یہاں سے قریب ہی ہے۔وہاں تک لاری جاتی ہے۔ میں بھی ایک لاری میں بیٹھ گیا۔ دو آنے کرایہ تھا۔ دس منٹ کی راہ تھی۔ پہاڑوں کی چڑھائی پر بہت سے مندر ہیں۔ کچھ بہت پرانے، آثار قدیمہ میں شامل۔ کچھ بالکل نئے، تازہ بنے ہوئے۔ پجاری پہلے پیسے لیتے ہیں، پھر مندر اور مورتیں دکھاتے ہیں۔ جادو کہیں نظر نہیں آیا ـــــ یہاں کی لڑکیوں کی آنکھیں بڑی خوبصورت ہیں۔ بڑی، بڑی، سیاہی مائل، نمناک سی، گویا قدرت نے محبت کوٹ کوٹ کر بھر دی ہے۔ کیا یہی جادو تو نہیں جس کا اتنا چرچا ہے؟ نظارہ دلچسپ تھا ـــــ اور دامن افق سے متصل، بادلوں کے سائے میں دریائے برہم پترا ابل کھا رہا تھا۔ ایک بجے شیلانگ جانے والا موٹر آیا۔ میں سوار ہو گیا۔

موٹر پہاڑوں پر چلا جا رہا تھا۔ پہاڑ ہی پہاڑ تھے۔ سرسبز درختوں سے ڈھکے ہوئے، آسمان سے باتیں کرتے ہوئے۔ دوسری طرف گہرائی تھی۔ سیکڑوں فٹ کی گہرائی۔ معلوم ہوتا تھا میں کسی دوسری دنیا میں آ گیا ہوں، جہاں شاید غم نہیں ہوتے، جہاں روح ملوث نہیں ہوتی، جہاں آدمی درندوں کی مانند برتاؤ نہیں کرتے، جہاں خدا ہے۔ موٹر چلا جا رہا تھا، ذرا ئیور کے رحم پر موقوف۔ اس سے بے خبر کہ وہ اپنی گدیوں پر کتنے بے وقوفوں کا بوجھ سنبھالے ہوئے ہے۔

---

6 مئی ـــــ شیلانگ!

شہر خوبصورت ہے۔ نشیب و فراز پر مکان نظر آتے ہیں، فضا بہت پیاری ہے۔ دارجلنگ کی مانند اتنی سرد نہیں کہ روح میں پیوست ہو جائے۔ میں ادھر اودھر گھومتا رہا۔ دیکھتا رہا وہ چیزیں جو کبھی نہ دیکھی تھیں۔ سوچتا رہا کہ جو قوت ایسے ایسے پہاڑ تعمیر کر سکتی ہے، وہ کس قسم کی ہوگی؟

تعجب تھا کہ اس ہوٹل میں صرف مرد ہی آ کر ٹھہرتے ہیں؟ آٹھ کمروں میں پانچ آباد اور پانچوں میں مرد ـــــ! تعجب ختم ہو گیا۔ ابھی ابھی دو بنگالی عورت نما لڑکیاں آئی ہیں۔ میرے کمرے سے متصل کمرہ لیا ہے۔ مسہری ایک ہی تھی۔ دوسرے کمرے کی مسہری بھی وہیں لگائی گئی ہے۔ تنہا ہیں ـــــ یعنی کوئی مرد نما باڈی گارڈ ہمراہ نہیں ہے۔ مینجر کہہ رہا تھا۔ کلکتہ کارپوریشن اسکول کی استانیاں ہیں۔ ایک بہت گوری ہے مگر بال بھورے ہیں اور ایک آنکھ بھنگی سی ہے۔ دوسری کا ناک نقشہ بہت اچھا ہے، ذرا سانولی ہے۔

---

7 مئی ـــــ دونوں سے صبح کے ناشتہ پر آپ ہی آپ تعارف ہو گیا۔ مینجر سے معلوم ہوا کہ ہوٹل سے تین میل کے فاصلے پر دو آبشار ہیں۔ ایک کا نام ہے "آبشار ہیڈن"

دوسرے کا آبشارے شپ ـــــ میں نے دونوں عورتوں سے ذرا ہچکچا کر پوچھا تھا، آیا وہ بھی چلیں گی۔ بولیں کہ آخر یہی چیزیں تو دیکھنے آئے ہیں۔ ہم تینوں چل کھڑے ہوئے۔ چڑھائی شروع ہوئی۔ تینوں آہستہ آہستہ چڑھتے رہے، آخر ایک چوٹی پر پہنچے۔ اب اترنا تھا۔ ہم تینوں نے اترنا شروع کیا۔ بڑے بڑے پتھروں کا سہارا لیتے ہوئے۔ آہستہ آہستہ دم روکے ہوئے۔ اکثر ڈھیلے پتھر ہمارے پیروں کے نیچے پھسل جاتے اور ہمارے دل دھک سے رہ جاتے۔ ہم اترتے رہے۔ تین سو فیٹ نیچے پہونچے ہوں گے کہ دونوں نے ہمت ہار دی۔ ایک پتھر پر بیٹھ گئیں۔ میں آگے بڑھتا رہا۔ نیچے نگاہ کام نہیں کرتی تھی۔ وہ دونوں بدحواس ہو گئیں۔ ڈر گئیں۔ مجھے پکارنے لگیں۔ "بے شی دور جا بن نا" (بہت دور نہ جائیں گے) انکی نگاہوں میں موت پھر رہی تھی، یقین ہو گیا کہ شاید اب گھر دیکھنا نصیب نہ ہوگا۔ نیچے، تاریک قبر کی مانند سطح آبشار ہمیں نگلنے کو تیار تھی۔ اوپر ـــــ آسمان سے باتیں کرنے والی چوٹیاں ہماری حالت پر مسکرا رہی تھیں۔ سامنے ـــــ پرشور آبشار، خدا معلوم کن کن وادیوں سے گذرتے ہوئے اپنی پوری قوت سے لڑھکتے ہوئے چلے آرہے تھے اور نامعلوم گہرائی میں گم ہو جاتے تھے۔ میں نے اوپر دیکھا۔ وہ جگہ نظر نہ آتی تھی جہاں سے ہم نیچے اترے تھے۔ خدا کی پناہ! کتنی گہرائی میں ہم آگئے تھے؟ اور اگر یہاں سے پاؤں پھسلے تو؟ - میری روح نے ایک جھرجھری لی۔ ہم تینوں کی صلاح ہوئی کہ واپس ہو جائیں۔ چڑھائی اگرچہ دل شکن تھی لیکن بدحواس ہونا موت کا نام لینا تھا۔ ہم واپس ہوئے۔ میں آگے تھا اور وہ دونوں ایک کے بعد ایک۔ میں آگے والی کا ہاتھ تھامے تھا۔ نرم گداز سا ہاتھ ـــــ اور ہم تینوں اوپر چڑھ رہے تھے۔ پتھروں پر پاؤں رکھتے ہوئے، درختوں کا سہارا لیتے ہوئے، ہواؤں کے تھپیڑے کھاتے ہوئے۔ ہم تینوں اوپر پہونچ گئے۔ ہمارے پیر زخمی ہو چکے تھے، ہماری انگلیاں جواب دے چکی تھیں۔

8/مئی ـــــ کل کا منظر یاد آرہا تھا۔ کتنی گہرائی تک ہم تینوں پہونچ گئے؟ زندگی کی تمنا نے ان دونوں کو بدحواس کر دیا تھا۔ میں شاید اس لئے اپنے حواس میں تھا کہ

میرے لئے موت نے کبھی کوئی اہمیت اختیار نہیں کی۔ اور پھر ان وادیوں میں مرنا جہاں آبشار کے نغمے لوریاں دے رہے ہوں، گویا خدا کی آغوش میں مرنا تھا۔

9رمئی ـــــ گذرے ہوئے دن یاد آرہے ہیں۔ گذری ہوئی محبت یاد آرہی ہے۔

خوشا وہ دن کہ میں نے بھی کسی کی آرزو کی تھی!

ایک ہلکی خاموش تمنا میری روح پر چھا گئی ہے۔ اگر وہ میرے ساتھ ہوتی تو؟ کس قدر بہم خیالات، کتنی ناممکن بات!

میری دونوں ہمسایہ عورتیں ایک دوسرے سے کچھ چھپا رہی ہیں۔ کل ان میں سے ایک ہلکے ہلکے گا رہی تھی:

''جے دن تمار گانلو بینا!'' (ٹیگور کا ایک گیت)

آواز اچھی تھی۔ میں سنتا رہا۔

10رمئی ـــــ اس کا خیال مجھے چین نہیں لینے دیتا۔ پہاڑوں کی خاموش فضاؤں نے میری محبت کو اپنے رنگ میں رنگ لیا ہے۔ مجھے وہ یکسوئی دے دی ہے جس میں ناکامی بھی ایک کامرانی ہے، ایک دولت ہے ـــــ یہ کیا؟ آج یہ خیال کیوں ستا رہا ہے؟ یہ آج مجھ سے کون کہہ رہا ہے:

''توان دونوں کے درمیان اسے کھو رہا ہے!''

غلط، بالکل غلط۔ اپنی محبت کی قسم، یہ بالکل غلط ہے۔ میں نے اپنی محبت سے عہد کیا ہے اور میں اس پر قائم ہوں۔ قائم رہوں گا۔ قسم، محبت کی قسم! جانے سے پہلے کم از کم شیلانگ ٹاپ (Shillong Top) تو دیکھ لو۔ راضی ہو گئی۔ ہم تینوں چل پڑے۔ شیلانگ کی سب سے اونچی چوٹی کی جانب۔

ہوٹل کے دیگر مسافران دونوں عورتوں سے میرے ربط وضبط کو رشک کی نگاہ سے

دیکھ رہے ہیں۔ سوچتے ہیں کہ موقعہ سے انہوں نے فائدہ کیوں نہ اٹھایا، خود آگے کیوں نہ بڑھے؟ ہوٹل سے شیلانگ کی چوٹی نو میل تھی۔ راہ میں ایک چائے خانہ ملا۔ بھوک سے برا حال تھا۔ ہم تینوں دیکھتے ہی ٹوٹ پڑے اور جو ملا کھا گئے۔ چائے خانے میں اور بیٹھنے والے ہمیں گھور گھور کر دیکھ رہے تھے۔

دو گھنٹے میں ہم شیلانگ کی سب سے اونچی چوٹی پر پہونچ گئے۔ نظارہ دلچسپ تھا۔ بہت روح افزا۔ معلوم ہوتا تھا گویا پوری کائنات ہمارے پیروں کے نیچے ہے۔ گویا ہم کائنات کی بلند ترین مخلوق ہیں۔ اوپر آسمان تھا اور ہوا میں تیرنے والے بادل کے ٹکڑے۔ نیچے، درختوں کے جھنڈ تھے۔ پہاڑوں کے نشیب وفراز میں کبھی کبھی کوئی آبشار سفید لکیر کی مانند نظر آجاتا تھا۔ اردگرد ـــــ خاموشی تھی، سناٹا تھا، ایک ایسی اداسی تھی جسے ہم سمجھنے سے قاصر تھے۔ یہ اداسی دل میں اتری جارہی تھی۔ دل کسی چیز کو چاہ رہا تھا۔ خواہشیں جاگ رہی تھیں، ویرانی ہمت افزائی کررہی تھی ـــــ اسی خاموشی میں، اسی ویرانی میں تین دل کبھی کبھی دھڑک اٹھتے تھے۔

---

12 مئی ـــــ ایک چلی گئی، بھنگی آنکھ والی۔ دوسری ابھی ہے۔ اچھے ناک نقشے والی، سانولی سی ـــــ یہ کیا؟ آج ہم ایک دوسرے سے زیادہ بے باک کیوں ہیں؟ شاید اس لئے کہ کسی تیسرے کا حجاب باقی نہ رہا۔ وہ بہت دیر تک میرے ساتھ سامنے والی پہاڑی پر ٹہلتی رہی۔ ہوٹل والے رشک سے گذر کر حسد تک پہونچ گئے ہیں۔ میں ایک عجب جذبے سے دوچار ہورہا ہوں۔ فخر وغرور سے معمور جذبے سے۔ وہ نوجوان جو ایک خوبصورت لڑکی کے ساتھ سیر کرتا ہے خود کو ایک تاجدار سے کم نہیں سمجھتا۔ پھر وہ جو بیک وقت دو کے ساتھ سیر کرچکا ہو؟ کتنی دلکش، کتنی فرحت بخش ہے یہ چیز کہ کسی حسین لڑکی کے ساتھ چائے پی رہے ہوں اور اسی ریسٹوران میں دوسروں کی نگاہیں رہ رہ کر اٹھ رہی ہوں، اور لڑکی سے زیادہ اس مرد پر پڑ رہی ہوں جس کے ساتھ دو لڑکی ہوں۔ دنیا کی حاسدانہ نگاہوں میں کسی

نوجوان کا رتبہ بڑھانے کے لئے اس سے عمدہ ترکیب، اس سے بہتر چیز کوئی اور نہیں۔

تمام خوشیوں، تمام عشرتوں میں عورت کمیاب ترین، نایاب ترین شے ہے۔ جس کی سب سے زیادہ قیمت ادا کی جاتی ہے کیونکہ سب سے زیادہ اسی کی مانگ ہے۔ لہذا یہی ایک شئے ہے جو اس قابل ہے کہ اس کا مالک اپنی ملکیت کی نمائش کرے۔ دوسروں کو ترسائے، خود خوش ہو ـــــ اور ایسا ہوتا ہے، ایسا کیا جاتا ہے ـــــ میں بہت خوش ہوں۔

---

13 رمئی ـــــ کوئی خاص بات نہیں۔

---

14 رمئی ـــــ صبح چائے پینے کے بعد ہم دونوں ''چیراپونجی'' جانے کو تیار ہوئے۔ موٹر والا بڑی مشکل سے تیرہ روپیہ پر راضی ہوا۔ تیس میل کا سفر تھا۔ تین گھنٹے میں پہونچے۔ یہ دنیا کی عجیب جگہوں میں ایک عجیب جگہ ہے۔ یہاں ساری دنیا سے زیادہ پانی برستا ہے۔ پہلی، دنیا کا دوسرا سب سے عظیم، سب سے بلند آبشار ہے۔ نام ہے ''موسمائی آبشار۔'' یہ 1800 فیٹ کی بلندی سے نیچے آتا ہے۔ ہم نے آبشار کو دیکھا۔ پانی کی ایک وسیع چادر معلوم نہیں کہاں کہاں کا سفر کرتی ہوئی آئی تھی، اور غل مچاتی ہوئی نیچے لڑھک رہی تھی۔ سطح زمین تک پہونچنے سے قبل اس کی شکل ایک پرزور سفید بھاپ کی ایسی ہوگئی تھی۔ نیچے بہت گہرائی میں سیاہ جنگل ہمیں نگلنے کو منہ کھولے تھا ـــــ پانی پی رہا تھا ـــــ پھر ہم ان گھاٹیوں میں آئے جن میں سے ''آبشار موسمائی'' کا پانی بہہ بہہ کر آرہا تھا۔ درمیان میں بڑی بڑی وسیع چٹانیں پانی کے تھپیڑوں کا منہ پھیر رہی تھیں۔ ہم دونوں ایک چٹان پر بیٹھ گئے۔ اور لگے مکھن روٹی اور کیک کھانے۔ وہ میرے قریب ہی بیٹھی تھی، کسی عجیب جذبے کے ماتحت۔ میں نے مکھن لگی ہوئی روٹی کا ایک ٹکڑا اپنے ہاتھ سے اسے کھلا دیا۔ اس کا چہرہ کسی کیفیت کا آئینہ دار تھا۔ شاید میرا بھی۔ وہ کسی آنے والے لمحے کے انتظار میں تھی، شاید میں بھی تھا۔ پھر نہیں معلوم کیوں اور کیونکر اور کس طرح میرے بازوؤں نے اسے اپنی گرفت میں پایا اور میرے ہونٹوں نے اس کے ہونٹوں کو ـــــ زندگی کا پہلا موقعہ تھا۔

میرے ہونٹ دیر تک کپکپاتے رہے۔

یہیں سے قریب ایک غار ہے۔ ''باباغار'' ہم دونوں چلے اسے دیکھنے کے لئے۔ ایک راہ پر ساتھ لیا۔ دو میل کی راہ تھی۔ راہ میں ہم نے مشعلیں خرید لی تھیں ورنہ غار میں کچھ بجھائی نہ دیتا اور ممکن تھا ہم پتھروں سے ٹکرا ٹکرا کر مر جاتے۔ غار کے دہانے پر پہونچتے ہی ہماری روح کانپنے لگی۔ اندر نگاہ کام نہیں کرتی تھی۔ ہم اندر داخل ہوئے۔ غار کے اوپر آبشار موسمائی کا پانی بہہ رہا تھا، جس کی سائیں سائیں نے ہمارے واہمہ کو پریشان کرڈالا تھا۔ ہم چڑھتے رہے۔ رک رک کر، پتھروں سے بچتے ہوئے، پتھروں ہی کو تھامتے ہوئے کچھ ہی دور گئے ہوں گے کہ وہ ایک چیخ مار کر پیچھے ہٹ گئی۔ ہماری مشعلوں کی دھندلی جھلملاتی ہوئی روشنی میں نگاہ کے سامنے ایک عجیب بھیانک شکل کھڑی ہوئی تھی۔ غور سے دیکھا تو معلوم ہوا کہ ایک بڑے پتھر نے یہ مہیب شکل اختیار کرلی ہے۔ میں نے ایک بلند قہقہہ لگایا —— کچھ خیالات آنے لگے تھے۔

15/مئی —— گھر سے تار آیا۔ لکھا تھا —— ''اپنی روانگی سے اطلاع دو!'' میں نے جواب دے دیا۔ کل کا غار یاد آرہا ہے۔ سوچ رہا تھا اگر وہ میرے شامل ہوتی تو اسی آبشار کے دامن میں، اسی چٹان پر، اسی غار کے اندر، ہم دونوں محبت کی باتیں کرتے، جوانی کے گیت گاتے، پھر اسی غار میں، غار کی تاریکی میں —— یہاں تک کہ ہم دونوں ایک دوسرے میں کھو جاتے، بھول جاتے اس دنیا کو جس نے ہمیں جدا کیا ہے، اور پورے کر لیتے وہ ارمان ——!

یہ تاریک خیالات تھے اور تاریکی میں پیدا ہوئے تھے۔ کتنا دلکش ہوتا ہے وہ گناہ جو تاریکی میں کیا جائے۔ آہ! میری محبت! روحانیت سے اتنی دور، خدایت سے اتنے فاصلہ پر! اور اب میں سمجھا کہ ہر تاریک شئے روحانیت سے کیوں دور ہوتی ہے اور پھر وہ محبت جو بے لوثی کی دعوے دار ہو لیکن کسی تاریک جذبے سے دب جائے؟ گناہ —— تاریک

ترین گناہ!

مجھے کیا ہوگیا ہے؟ کل کا چٹان والا واقعہ کیوں یاد آرہا ہے؟ کسی کی محبت کے باوجود میرے ہونٹ گناہ پر کیوں مجبور ہو گئے؟ ـــــ آخر ان کا کنوارا پن ختم ہوگیا نا! ـــــ شرم! شرم!

دماغ انہیں خیالوں سے ٹکرا رہا تھا کہ ڈاکیہ کی آواز آئی ـــــ ''بابو تار آیا ہے'' ـــــ دل دھک سے ہو گیا، خدا خیر کرے، ابھی گھنٹہ بھر قبل ایک تار آچکا ہے، اب کیا ہوا؟ ڈرتے ڈرتے تار لیا، کانپتے ہوئے ہاتھوں سے کھولا۔ نگاہ کے سامنے صرف ایک سطر تھی:-

''تم پاس ہو گئے، فرسٹ کلاس آنرز!''

والد صاحب کا تار تھا۔ میں نے ادھر ادھر دیکھا۔ کوئی نہ تھا جس کے چمٹ جاتا اور اگر میری وہ ہوتی تو؟ ـــــ متصل کمرے میں دو بنگالی لڑکی سو رہی تھی۔ میں نے جگا دیا۔ پاس ہونے کی خبر سنائی۔

---

16 / مئی ـــــ کوئی خاص بات نہیں۔ ''ماگھم کی رنگین نقاب'' پڑھتا رہا۔ ناول بہت ہی نفیس ہے۔

---

17 / مئی ـــــ دوسری بھی آج جا رہی ہے۔ مجھے الوداع کہنے آئی۔ یکایک نگاہیں جواب آمیز ہو گئیں۔ شاید کچھ یاد آ گیا تھا۔

پھر وہی تنہائی اور خاموشی۔ وہی خاموشی اور سکوت اور ان کے درمیان کبھی کبھی میری کوئی آرزو!

---

18 / مئی ـــــ کچھ تمنائیں، کچھ خوابیدہ آرزوئیں جاگ اٹھی ہیں۔ غور کر رہا ہوں۔ سمجھتا ہوں پھر بھی کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔ یعنی سمجھ کر بھی نہیں سمجھ سکتا۔ دل نہیں مانتا۔

بہلنا نہیں چاہتا۔ یہ سب آخر کس لئے؟ جو تجھے بھول گیا ہے۔ تو اسے بھول جا۔ یہ تڑپ، یہ بے چینی، یہ بے کلی کس کے لئے؟ جس کی امید نہ ہو اس کی آرزو بے کار، جستجو بے کار! دل سے کہہ کہ اپنے آپ سے محبت کر، اپنے وجود سے محبت کر، یہی معراج محبت ہے۔

---

19 رمئی ــــ آرزوئیں نہیں مانتیں، تڑپاتے جا رہی ہیں۔ ظالم ہیں! نیندیں چھین لیتی ہیں۔ کیا ہونے والا ہے؟

---

20 رمئی ــــ فیصلہ ہو گیا- آرزو ہی کا نام زندگی ہے۔ یہ ہماری آرزوئیں ہیں جو ہمیں بے چین رکھتی ہیں۔ اور جب ہم ان پر غور کرتے ہیں تو دیکھتے ہیں کہ ہماری آرزوئیں ہماری زندگی سے وابستہ ہیں۔ پھر ہم زندگی کی آرزو کرنے لگتے ہیں۔ وہ زندگی ہی کیا جو ہر آرزو سے دور ہو؟ــــ لیکن اگر زندگی نہ ملتی تو آرزوئیں کہاں ہوتیں؟ اور ہر آرزو بذات خود کیا ہے؟ ایک جستجو! کسی کی جستجو! معلوم یا نا معلوم! جستجو کامیاب ہوتی تو آرزو فنا اور زندگی بھی فنا۔ گویا کچھ باقی نہیں رہتا۔ کسی کی ضرورت بھی نہیں۔ خدا کی بھی نہیں۔ کسی نے خوب کہا ہے:

ہم خدا تھے گر نہ ہوتی ساتھ کوئی آرزو
آرزوؤں نے ہماری ہم کو بندہ کر دیا!

لیکن یہ آرزو کیوں ہے؟ کیا ضرورت ہے کسی آرزو کی؟ اچھا، تو زندگی سے اس کی آرزوئیں چھین لو! پھر کیا ہوگا؟ــــ اُف! کسی بھیانک تصویر! ڈال دو، اس نقاب کو ڈال دو ورنہ انسانیت عریاں ہو جائے گی۔ حیوانیت میں تبدیل ہو جائے گی۔ کیا فرق رہ جائے گا پھر بھیڑ بکری میں اور ایک انسان میں؟ کون سا زینہ ہمیں بلندیوں پر لے جائے گا؟ کونسی راہ منزل کی رہنمائی کرے گی؟ یہ روحانیت، یہ حسن و عشق! یہ سیاست و حکمرانی، کیوں کر ملیں گی یہ چیزیں؟ آرزو کر! جستجو کر!

21/مئی ـــــ پہاڑوں کی تنہائی میں گھومتا رہا۔ کل شام کو واپس جا رہا ہوں۔ چاہتا ہوں اس سبزہ زار کو جی بھر کر دیکھ لوں، شاید پھر دیکھنا نصیب نہ ہو ـــــ میرے چاروں طرف چیڑ کے گھنے درخت ہیں۔ میں ان کے درمیان کھڑا ہوں۔ دور تک کوئی نظر نہیں آتا۔

واپس ہوا تو تنگ پہاڑی راہ میں ایک پہاڑی گائے کھڑی گھاس چر رہی تھی۔ راہ بند ہوگئی تھی۔ میں کھڑا ہوگیا۔ گائے نے میری طرف دیکھا، میں نے گائے کی طرف اور جب جب میں نے بڑھنے کی کوشش کو تو اس نے چرنا چھوڑ دیا۔

22/مئی ـــــ اے پہاڑوں کی حسین چوٹیو! میں آج تم سے رخصت ہو رہا ہوں۔ دل بہت بے چین ہے۔ تمہارے دامنوں میں میں نے بہت سے پرسکون لمحے گذارے ہیں۔ شہروں کی ہلچل اور گناہوں سے معمور دنیا سے دور تمہاری آغوش میں میں نے وہ زندگی پائی تھی، جس کے لئے میری روح ہمیشہ تڑپتی رہتی تھی۔ تمہیں کیا معلوم کہ ایک ناکام آرزو، ایک حسرت نصیب، جس سے اس کی تمنائیں چھین لی گئی ہوں، تمہارے سرسبز دامنوں کی تنہائی میں کتنا تسکین پاتا ہے۔

تمہارے روبرو اپنی محبت لے کے آیا تھا! وہ محبت جو قبول نہیں کی گئی، جو عرصہ ہوا ٹھکرادی گئی ہے۔ وہی زخمی، وہی بے بس محبت لے کے آیا تھا! اسے پاکیزگی دو، اپنے مانند زندگی بخشو! اے ہمیشہ قائم رہنے والی پہاڑیو! اپنی ہیشگی وروحانیت سے ایک حصہ میری ناکام، میری مجروح محبت کو بھی دے دینا ـــــ تم نے اس کا نام ضرور سنا ہوگا۔ اسی کا جس سے مجھے محبت ہے۔ میں نے تمہاری تنہائیوں میں اس کا نام اکثر لیا ہے۔ تمہارے دامنوں کی ہری بھری گھاس گواہی دے گی جو اکثر میرے آنسوؤں سے تر ہوئی ہے۔ وہ مجھے بھول گئی ہے، بھول جاتی ہے، مجھے اس کی شکایت نہیں ہے۔ لیکن میری تمنا ہے کہ میں اسے کبھی نہ بھولوں، میری نگاہوں کے آنسو کبھی خشک نہ ہونے پائیں۔ اور جب کبھی تمہارے دامن

میں پناہ لینے آؤں تو تم سے کہوں کہ دیکھو! میں اسے نہیں بھولا کیونکہ تم نے میری محبت کو استوار کیا ہے، تم نے اسے روحانیت دی ہے، ہمیشگی دی ہے۔

اے حسن کی دیویو! میں اس دنیا میں جارہا ہوں جس نے ذرا سے بہانہ پر میرے ارمان چھین لئے۔ جہاں محبت جرم ہے، گناہ ہے —— جہاں مطلب پرست آباد ہیں اور تمناؤں کو کچل ڈالتے ہیں —— مگر میں پھر آؤں گا، جلد آؤں گا، تم بھی تنہا ہو، میں بھی تنہا ہوں، تنہا ہی رہوں گا۔ اب جب آؤں گا تو تنہا نہ ہوں گا۔ اپنے وسیع دامن میں دوگز زمین مجھے بھی دے دینا۔ شاید تمہاری خاموش لوریوں میں نیند آجائے تو سو رہوں گا —— الوداع، الوداع!

23رمئی —— پہونچ گیا۔ اسٹیشن پر اماں اور بابا موٹر لئے کھڑے تھے —— بھائی بھی آئے تھے —— پھر وہی گھر —— میری وہی تنہائی —— الماری کی وہی کتابیں —— طبیعت مضمحل ہے، نیند آرہی ہے —— بستر پر لیٹ گیا۔

نیند نہیں آئی، آنکھیں بند کئے پڑا رہا۔ ایک دھندلے جواب کی مانند ایک زمانہ یاد آرہا ہے۔ سنہ۔ محلہ۔ کسی کا الڑھپن —— محبت —— وعدے —— راجہ صاحب —— سنہ —— اس کی شادی —— پرویز —— اور بس! ڈرامہ ختم ہوا! اب کچھ نہ تھا سوائے میرے، میری برباد شدہ آرزوؤں کے، میری حسرتوں کے —— مگر میں مطمئن ہوں، یہی قانون محبت ہے۔ وہ کسی پھول کے قابل نہیں جو کانٹوں سے معمور ہو!

دلِ بے تاب، ٹھہر! کیا ڈھونڈ رہا ہے؟ سکون؟ یکسوئی؟ —— یہاں نہیں ملے گی۔ اس گھر میں نہیں، اس دنیا میں نہیں۔ چل وہیں چل —— بادلوں کی دنیا میں —— وہاں تسکین ملے گی، تنہائی ملے گی، سکون ملے گا! چھوڑ اس دنیا کو، چھوڑ اس دنیا کے دھندے، یہاں حیات نہیں، زندگی نہیں، کلیوں کی مسکراہٹ غلط، پھولوں کی شگفتگی فریب،

قوس قزح کی رنگینیاں فانی ـــــ پھر اس کائنات میں کیا ہے۔ سوا ایک ذات واحد کے اور اس کے بعد محبت! محبت! محبت!!

اور اگر مر گیا تو؟ ـــــ ماں دیوانی ہو جائے گی۔ باپ کو غم ہوگا کہ ایک مددگار چل بسا۔ دوست کہیں گے۔ ''وہ پاگل فلسفی؟ کتنا عجیب تھا وہ!'' اور وہ کیا سوچے گی؟ ہاں، پھر شاید اسے بھی افسوس ہوگا کہ اس خود غرض دنیا میں ایک انسان وہ بھی تھا جس نے اس سے محبت کی، پاک اور بے لوث محبت۔ ٹپکنے والے دو آنسو ـــــ زود پشیماں کی پشیمانی!

12/ستمبر ـــــ پھر وہیں جا رہا ہوں۔ پہاڑیوں سے وعدہ کیا تھا کہ جلد آؤں گا۔ دیر ہو گئی ہے۔ وعدہ پورا کرنا ہے۔

13/ستمبر ـــــ اتفاق! وہی ہوٹل پھر ملا ہے۔ کمرے کی ہر چیز وہی ہے۔ دوسرے کمرے بھی آباد ہیں۔ سامنے والی پہاڑی کچھ یاد دلا رہی ہے۔ میں کچھ سوچ رہا ہوں ـــــ ایک سفر درپیش ہے ـــــ طویل، مگر جلد طے ہو جانے والا۔ زادراہ ـــــ؟ خدایا ـــــ رحم!

نوٹ: اس کے بعد نیلی کاپی خاموش ہے۔ پراسرار طور پر خاموش۔ ہوٹل اب تک وہی ہے۔ کمرے بھی وہی ہیں۔ بظاہر کسی چیز کی کمی نہیں ہے سوائے ان دو عورتوں کے جن کا ذکر مصنف نے اپنی ڈائری میں کیا ہے ـــــ میں نے ڈائری پڑھی، پھر اپنے ساتھی کے حوالے کر دی۔

''یہ باتونی بڈھے کی داستانوں سے زیادہ دلچسپ ہے!'' میں نے کہا۔

☆☆☆

مطبوعہ رسالہ خیام، لاہور، 24/جولائی 1940ء

ڈاکٹر ــــــــ !

اس کے منہ سے ایک دبی ہوئی چیخ نکل گئی۔

''کیا ہے؟'' عرفانی نے اپنی گرفت ڈھیلی کرتے ہوئے پوچھا۔

''کس نے دروازہ ہلایا۔'' سائرہ نے آنچل درست کرتے ہوئے سانس روک کر کہا۔

''ہش! صرف وہم ہے تمہارا۔''

''نہیں مجھے یقین ہے کہ ــــــ''

''کیا ــــــ؟''

''ڈاکٹر احمد شکیل!'' سائرہ نے جواب دیا۔

''اس کے آنے کا یہ وقت نہیں ہے'' عرفانی نے یقین دلاتے ہوئے کہا۔ ''اس کا یہ وقت نہیں۔ وہ حسب معمول اس وقت اپنے معمول میں ہوگا اور مان لو اگر وہی تھا تو پھر کیا، تم اپنا کمرہ بند کر کے سو رہی تھیں!''

''لیکن تم اپنی ہیٹ جو باہر کھونٹی پر ٹانگ آئے!''

''اس کا کون خیال کرتا ہے۔ فضول خود کو پریشان نہ کرو۔ نہیں جانتیں میں اس کا افسر ہوں!'' اور پھر دونوں ایک دوسرے کی نیم عریاں آغوش میں پہونچ گئے۔

(۱)

لیکن جب سائرہ، عرفانی کو رخصت کر کے نیچے آئی تو اس کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں۔ سانس کی رفتار میں فرق آ گیا، کسی نامعلوم خطرے کے احساس کے ساتھ وہ اس میز کی جانب بڑھی جس پر ایک خوبصورت سی کتاب رکھی تھی اور اس میں ایک پرچہ رہا تھا۔ اس

نے پرچہ گھسیٹ لیا، لکھا تھا:

''سائرہ، تم نے جس کتاب کے لئے کہا تھا، وہ آج صبح مجھے مل گئی۔ ابھی اتفاقاً اس طرف سے گذرا تو کتاب ہاتھ میں تھی۔ خیال آیا تم کو دیتا چلوں۔ اور ہاں آج کھانے پر میرا انتظار نہ کرنا، ایک جگہ دعوت ہے، رات گئے تک آؤں گا، احمد شکیل۔''

وہ پھٹی پھٹی نگاہوں سے پرچہ اور کتاب دیکھتی رہی، پھر نوکر کو بلایا:

''کیا ابھی صاحب آئے تھے؟''

''جی ــــــ!''

''اوپر گئے تھے؟''

''اوپر۔ اوپر نہیں جانتا، بی بی صاحب! ہم کام کرتا تھا۔'' بنگالی نوکر نے اس نئی تفتیش سے گھبرا کر کہا۔ وہ کھڑی سوچتی رہی۔

(۲)

سائرہ اور احمد شکیل کی شادی بڑی عجیب طرح سے ہوئی۔ سائرہ ایک متمول اور تہذیب نو کے دلدادہ والدین کی سب سے بڑی لڑکی تھی اور موجودہ معیار کے مطابق کافی تعلیم یافتہ بھی۔ جب اس کی نسبت کے پیغام آئے تو سب رد کر دیئے گئے۔ بی۔ اے پاس لڑکی کسی ''انگلینڈ ریٹرنڈ'' کے خواب تمنا میں محو، ہندوستانی ''گریجویٹوں'' کو کوئی وقعت نہیں دیتی تھی۔ دن گذرتے گئے۔ سائرہ کی دونوں چھوٹی بہنیں اپنے اپنے گھروں سے آسودہ ہو گئیں، لیکن سائرہ کا خواب خواب ہی رہا۔ ایک جوان مغربی تہذیب کی حشر انگیز جذباتی فضا میں پلی ہوئی جوان لڑکی کا خواب!

پھر ایک دن ڈاکٹر احمد شکیل سے تعارف ہو گیا۔ گھر میں کوئی بیمار تھا اور ڈاکٹر اسے دیکھنے آیا تھا۔ باتوں باتوں میں دونوں ایک دوسرے سے متعارف ہو گئے۔ ڈاکٹر میں عذرا کے لئے کوئی کشش نہ تھی، اور ہو بھی کیسے سکتی تھی؟ ایک خشک خیال، خاموش، موٹی عینک والا ڈاکٹر، اور کہاں ایک محفل پسند، امنگوں سے معمور، سیاہ چشم لڑکی!

لیکن دونوں اکثر ایک دوسرے سے ملتے۔ کبھی پارک میں، کبھی سرِراہ، کبھی ادھر ادھر!

ڈاکٹر کو شاید اپنی پرامن زندگی زیادہ پسند نہ آئی۔ یا ممکن ہے کسی سہانی شب نے اس میں تنہائی کا احساس پیدا کر دیا ہو؟ بہر کیف، ایک دن جبکہ دونوں نمائش صحت سے واپس آ رہے تھے، ڈاکٹر نے بغیر کسی تمہید، بغیر کسی تکلفانہ جملے کے، سائرہ کو شادی کا پیغام دے دیا اور پھر ڈاکٹر کے سوا سب کو تعجب ہوا کہ عذرا نے اس کا پیغام قبول کر لیا تھا۔

کچھ دنوں بعد دونوں کی شادی ہوگئی۔ یہ سائرہ کے خواب کی تعبیر تھی!

دن گذرتے گئے اور ڈاکٹر کو حکومت بنگال کے محکمۂ صحت میں شامل کر لیا گیا۔ حکومت نے اسے ''سندر بن'' ڈویژن کا سب انچارج بنا کر وہاں بھیج دیا۔ وہیں اس سے اور کرنل عرفانی سے ملاقات ہوئی جو محکمۂ صحت کا مستقل سکریٹری اور جسمانی کھیلوں کا شائق تھا۔ اور فی الحال دو تین ماہ کی رخصت پر سندر بن میں بغرض شکار آیا ہوا تھا۔ عرفانی ایک اچھا شکاری تھا اور ہر ایک سے بہت جلد بے تکلف ہو جانا اس کی خصوصیت تھی۔ سڈول جسم، چمکیلی اور عمیق نگاہوں اور ایک دلکش مسکراہٹ کا مالک تھا۔ عمر چالیس کے لگ بھگ تھی مگر اس کی صحت تیس (۳۰) سے زیادہ کہنے کی اجازت نہیں دیتی تھی۔ فطرت کا محتاط، زندہ دل، شوقین طبیعت، لیکن ——

احمد شکیل جب پہلی بار عرفانی سے ملا تو اس کے بارے میں نہایت نفیس رائے قائم کرتے ہوئے وہ اپنی عادت کے خلاف اس سے بہت جلد بے تکلف ہو گیا۔ فرصت کے اوقات میں دونوں اکثر ساتھ پائے جاتے۔ بے تکلفی بڑھتی رہی اور ایک دن شکیل نے عرفانی کو اپنے یہاں دعوت دے دی۔

دعوت کا انتظام سائرہ کے سپرد تھا اور وہ خوش تھی کیونکہ شکیل کے منہ سے عرفانی کے بارے میں سن چکی تھی، خوش تھی کیونکہ آج ایک نئے شخص سے متعارف ہونے والی تھی۔

اس حسین عورت کی مانند جسے اپنے حسن کا احساس ہو لیکن اس کی کامیاب نمائش سے محروم رہی ہو۔

دعوت شروع ہوگئی۔ شکیل نے عرفانی کو بتایا کہ کس عجیب اتفاق سے اس نے اپنی شریک زندگی کو حاصل کیا تھا۔ عرفانی نے جواب دیا کہ ''قیمتی چیزیں بعض اوقات توقع سے زیادہ سستی مل جاتی ہیں'' اور یہ کہتے ہوئے اس نے سائرہ پر ایک مسکراتی ہوئی نگاہ ڈالی۔ سائرہ پھل تراش رہی تھی۔ اس نے ان نگاہوں کو دیکھا اور اپنی نگاہیں جھکالیں، شاید وہ ان کا مطلب سمجھنے کی کوشش کر رہی تھی ـــــ کافی دلچسپیوں کے بعد دعوت ختم ہوگئی۔
مگر سائرہ کے دل میں خلش بیدار ہو چکی تھی ـــــ کتنا حسین تھا عرفانی!

اگر چہ شکیل اور سائرہ کو باہم ایک عرصہ گذر چکا تھا مگر پھر بھی سائرہ، شکیل کو نہ سمجھ سکی اور ہمیشہ یہی خیال کرتی رہی کہ اس کے شوہر میں یقیناً کوئی ایسی شئے ہے جو اس کی سمجھ سے باہر ہے۔ شکیل شادی کے اولین دنوں میں بھی خاموش تھا اور اس کے بعد بھی خاموش ہی رہا۔ وقت کا پابند تھا اور اس کی ضرورتیں مختصر تھیں۔ فرصت کے اوقات یا تو طبی کتابوں کے مطالعہ میں گذار دیتا، یا کسی شام کو کسی بلیرڈ کلب میں چلا جاتا اور گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ کھیل کر واپس آجاتا، لیکن اس خشک فطرت کے باوجود اسے سائرہ سے محبت تھی۔ دلی، عمیق اور خاموش محبت!

سائرہ کسی خاموش محبت کی طلبگار نہ تھی۔ وہ اس محبت کو سمجھنا نہیں چاہتی تھی، یا سمجھنے کی صلاحیت ہی نہ رکھتی تھی۔ اسے اپنے حسن کا احساس تھا اور اس کی تمنا تھی کہ اس کے حسن سے لطف اندوز ہونے والا اس کے حسن کا اعتراف کرے، اس کی تمناؤں کے لمحے خاموش نہ ہوں، الفاظ گرم سانسوں میں تبدیل نہ ہو جائیں۔ اس نے کتنے آدمیوں، کتنی درخواستوں کو ٹھکرا دیا تھا، آخر کس لئے؟ اس کے رنگین خواب رنگین تر تعبیر چاہتے تھے، اس کی بے چین آرزوئیں طوفاں بدوش آرزوؤں سے ملنا چاہتی تھیں۔ لیکن وقتی اثر، وقتی

جذبات کی روحیں کھوکر وہ ہمیشہ کیلئے جس کی ہو چکی تھی وہ خاموش تھا، اس کے حسن کی کافر سامانیوں کے باوجود بالکل خاموش!

سائرہ کو یہ احساس بھی ضرور تھا کہ شکیل کو اس سے محبت ہے اور گہری محبت۔ لیکن اس احساس کے باوجود اس کی زندگی مسرت حقیقی کی ان شعاعوں سے خالی تھی جن کی فضول تمناؤں کا خواب وہ شادی سے قبل دیکھ رہی تھی۔ مغربی تعلیم وتہذیب کے اثر نے جس نام نہاد آزادی کی آرزو اس کے دل میں پیدا کر رکھی تھی، وہ شکیل کی نظر میں غلط تھی اور یہی وجہ تھی کہ ہر سامان راحت کے باوجود عذرا کی یہ خواہش کہ وہ بھی کلبوں میں جائے، ٹینس کھیلے، سیر کرے، کبھی پوری نہ ہوئی۔

سب سے زیادہ یہ کہ وہ حسین تھی اور جوان عورت کی مانند چاہتی تھی کہ اس کے حسن کی قدر شناسی کا دائرہ کسی ایک شخصیت تک محدود نہ ہو، اس شکاری کی مانند جسے اپنے تیر اور نشانے پر بھروسہ ہو اور ہر روز ایک نئے شکار کا یقین رکھتے ہوئے سرگرم جستجو ہو!

لیکن شکیل سے وابستہ ہو کر اس کے یہ کل خیال خواب ہو کر رہ گئے۔ اگرچہ اس کے لئے کوئی بندش نہ تھی اور وہ آزاد تھی کہ جو جی چاہے کرے، لیکن شکیل کی خاموش اور عجیب طبیعت کو وہ بالکل نہ سمجھ سکی تھی اور اس لئے وہ اپنے ارادوں کے خلاف مجبور تھی کہ خود کو اسی ماحول کا عادی بنائے۔ اور حقیقت تو یہ تھی کہ وہ دل ہی دل میں شکیل کی خاموشی سے خائف بھی تھی۔

نئے اسباب حالات کی روش بدل دیتے ہیں۔ شکیل کا ''سندر بن'' کے علاقوں میں آنا سائرہ کی فرسودہ تمناؤں کا روشن ہو جانا تھا۔ وہ عرفانی سے بالکل اچانک ملی اور بالکل اچانک ہی اس کی کل دفن شدہ اور بھولی بسری آرزوئیں اس کے جوان اور رنگین دل کے ہر گوشے میں بیدار ہو گئیں۔ اسے محسوس ہوا کہ جو پیاس اسے اب تک بے چین کئے ہوئے تھی، اسکے کسی قدر بجھنے کا وقت آ گیا تھا۔

اور اب موقعہ تھا کہ وہ عرفانی اور شکیل کا موازنہ کرے اور اس نے بار ہا خیالات کی رو میں ان دونوں کا موازنہ کیا بھی۔ دونوں میں کتنا فرق تھا؟ عرفانی کے پاس کیا نہیں تھا جس کی اسے آرزو تھی؟ دلکش مسکراہٹ، پر شوق اور رنگین باتیں، گداز اور مضبوط جسم اور ہمت سے کھیلوں کی چمپئن شپ! اس کے مقابلہ میں ایک خشک خیال ڈاکٹر کے پاس تھا ہی کیا اور ہو بھی کیا سکتا تھا؟ بے کیف ہنسی، نحیف جسم، موٹی موٹی کتابیں، عجیب عجیب آلے اور ایک معمل! اور اگر وہ "بلیرڈ" کا ایک اچھا کھلاڑی تھا بھی تو کس کام کا، کوئی بلیرڈ دیکھنے تھوڑے ہی آیا کرتا ہے ـــــ اور اس تقابل کا نتیجہ اس نے یہ نکالا کہ مشیت نے غلطی سے اسے فارانی کے ہاتھوں سے چھین کر شکیل کے قدموں میں لا ڈالا ہے۔ وہ مشیت کے اس ظلم کا پورا انتقام لینے کے لئے تیار ہو گئی۔

اس تقابل کا ایک نتیجہ یہ بھی تھا کہ زندگی میں پہلی مرتبہ سائرہ کے دل میں جہاں شکیل کا خوف تھا، وہاں حقارت نے بھی کسی قدر جگہ لے لی۔ لیکن شکیل کو سائرہ سے محبت تھی اور وہ محبت کرتا رہا۔

اس دن عرفانی کے جانے کے بعد سائرہ بہت دیر تک سوچتی رہی۔ رہ رہ کر اسے یہ خیال پریشان کر رہا تھا کہ اگر دروازہ ہلانے والا شکیل ہوا تو؟ کیا اسے معلوم ہو گیا؟ کیا اس نے سمجھ لیا کہ کمرہ کس لئے بند تھا اور اس کے اندر کیا ہو رہا تھا؟ پھر اسے شکیل پر بے حد غصہ آ گیا ـــــ وہ آخر بے وقت آیا ہی کیوں؟ اس کا تو وہ وقت تھا ہی نہیں، اب کیا ہوگا؟ بدنامی! اور وہ گھبرا گئی، اس نے ٹیلی فون اٹھایا ـــــ

"کون عرفانی؟ ہاں، میں ہوں۔ جانتے ہو کیوں ٹیلی فون کیا ہے؟ میں اس وقت بہت پریشان ہوں، وہ ریاض تھا، ہاں شکیل، مجھ سے نوکر نے کہا تھا کہ صاحب آئے تھے، وہ کتاب بھی رکھ گیا ہے، اب کیا ہوگا؟ تم فوراً آ جاؤ، وہ رات گئے تک آئے گا، دعوت میں گیا ہے ـــــ"

مگر عرفانی نے کہا کہ وہ نہیں آسکتا، چند بہت ہی اہم کاموں میں پھنسا ہوا ہے۔ لیکن اس نے سائرہ کو مطمئن کردیا کہ اگر کچھ ہوا تو وہ اس کے ساتھ ہے ـــــ اور سائرہ بھی چاہتی تھی، اسے اسی اطمینان کی ضرورت تھی، اس نے سوچا، شکیل کی خاموش طبیعت کسی عام بدنامی پر مائل نہ ہوگی، ممکن ہے وہ اس کا ذکر ہی نہ کرے، ممکن ہے مجھے خاموشی سے علیحدہ کردے، تو پھر کیا۔ میں تو خود ہی چاہتی ہوں کہ وہ مجھے طلاق دیدے، پھر میں آزاد ہوں گی، آزاد! عرفانی کیلئے اس کے دل میں شکیل کے لئے نفرتیں امنڈ آئیں ـــــ

''بزدل کہیں کا! ہمت تھی تو اندر کیوں نہ آگیا؟'' اس نے کہا۔

شام ہوگئی مگر سائرہ سوچتی رہی، رات ہوئی مگر سائرہ پلنگ ہی پر پڑی رہی۔ سوچتی رہی۔

بنگلے میں موٹر داخل ہونے کی آواز ہوئی۔ وہ چونک پڑی۔ وہ آگیا۔ اب کیا ہوگا؟ اس نے سوچا، اسے خود تعجب تھا کہ عرفانی کے یقین دلانے کے باوجود وہ اس وقت اتنی خوفزدہ کیوں تھی۔

دروازہ کھلا اور اس کا شوہر کمرے میں داخل ہوا۔

''کیوں، کیسی ہو؟'' اس نے حسب معمول نرمی سے پوچھا۔ بظاہر اس کے انداز میں کوئی تبدیلی نہ تھی۔

''یونہی، یونہی سر میں ذرا درد ہے۔'' سائرہ نے جواب دیا۔ اسے اس وقت اپنے آپ پر سخت غصہ آرہا تھا۔ آخر وہ کانپ کیوں رہی تھی۔

''اچھا تو تم آرام کرو، مجھے کچھ کام ہے۔'' اور وہ چلا گیا۔ بغیر یہ پوچھے ہوئے کہ وہ دن کو کمرے میں کیا کر رہی تھی۔

سائرہ لیٹے لیٹے سوچتی رہی ـــــ ''آج اس نے نگاہ ملا کر بات نہیں کی، وہ آخر چاہتا کیا ہے؟ کیا کرنا چاہتا ہے وہ ـــــ؟'' اس کا دل دھڑکنے لگا، خیالات کی اُدھیڑ بن میں اس کی آنکھ لگ گئی ـــــ وہ چونک پڑی، خواب! کتنا عجیب! اس نے دیکھا کہ وہ ایک

ایسی جگہ پہونچ گئی ہے جہاں ہر طرف موت ہے، موت! ڈراؤنی، اچانک اور عجیب! پھر جہاں موت کی تاریکی پھیلی ہوئی ہے، اس کا شوہر روشنی کرنے کی کوشش کر رہا ہے۔ ٹمٹماتے ہوئے چراغوں کو خاموش ہونے سے بچا رہا ہے۔ پھر اس نے دیکھا کہ یکا یک ایک چراغ ٹمٹمائے بغیر بجھ گیا ـــــ اس کی آنکھ کھل گئی۔

وہ پھر سو گئی مگر جلد جاگ اٹھی۔ اس نے ایک اور خواب دیکھا۔ اس نے دیکھا کہ عرفانی کے بازو اسے اپنی گرفت میں لئے ہوئے ہیں اور اس کے ہونٹوں کے مس نے سائرہ کی ساری دنیا تبدیل کر دی ہے ـــــ صبح ہوتے ہی وہ پھر سو گئی۔

وہ جب اٹھی تو سورج بلند ہو چکا تھا اور شکیل باہر جا چکا تھا۔ نوکر نے چائے لا کر رکھی۔ سائرہ نے اس سے شکیل کے بارے میں پوچھا:

''صاحب کچھ کہہ گئے ہیں؟''

''جی نہیں ـــــ!''

''چائے پی کر گئے ہیں؟''

''جی نہیں ـــــ!''

سائرہ نے زبردستی چائے اپنے حلق میں انڈیل لی۔ اس کا دل اندر ہی بیٹھا جا رہا تھا، اسے کسی سہارے کی ضرورت تھی اور وہ سہارا ڈھونڈ رہی تھی۔ آخر اس کا جرم کیا تھا؟ یہی نا کہ اسے عرفان سے محبت تھی! تو کیا محبت جرم ہے؟ اس نے تو کسی کتاب میں یہ نہیں پڑھا تھا۔ وہ محبت چاہتی تھی، محبت کی منتظر تھی، اور آخر اس کی تمنا پوری ہو گئی۔ اسے محبت مل گئی، ولولہ انگیز، پرجوش اور بے باک! اس کی تاریک زندگی میں عرفانی ایک روشن شعاع بن کر آیا اور اس کے دل کے ذرہ ذرہ کو منور کر گیا۔ بس اتنی سی بات پر دنیا اسے مجرم قرار دے دے گی؟ اس کے دل کے کسی گوشے سے آواز آئی۔ ''تجھے اپنے شوہر سے محبت کرنا چاہئے تھی!'' ـــــ شوہر سے محبت! ہاں ضرور لیکن اس دنیا میں ہر ''چاہئے'' کو کوئی کہاں تک نباہے؟ اس کے شوہر میں کیا تھا جو وہ محبت کرتی؟ کیا وہ اس کی موٹی موٹی کتابوں سے محبت

کرتی؟ اس کے معمل سے دل لگاتی؟ کیا یہ کافی نہیں تھا باوجود اس کی عجیب خلقت اور خشک مزاجی کے وہ اس سے نفرت نہیں کرتی تھی؟ اور عرفانی؟ آہ! کتنا ہنس مکھ، کتنا تسکین بخش! اس کے کشادہ بازوؤں میں آنے کے بعد وہ اپنا سب کچھ بھول جاتی تھی۔ وہ ایک جھٹکے کے ساتھ اٹھی اور ٹیلی فون اٹھایا۔

''کون عرفانی؟ میں ہوں سائرہ! تم چلے آؤ، بس چلے آؤ، مجھے تمہاری ضرورت ہے۔''

اور جب عرفانی آیا تو پھوٹ پڑی۔ دیر تک اس کے بازوؤں میں سسکیاں لیتی رہی۔

''اسے سب کچھ معلوم ہے!'' سائرہ نے سسکتے ہوئے کہا اور اپنی انگلیوں کو اس کے بالوں میں الجھا دیا۔

''تم فضول پریشان ہوتی ہو!'' عرفانی نے اسے تسلی دی اور اپنے ہونٹ اس کے ہونٹوں پر رکھ دیئے۔

''تمہیں قریب پا کر میں کتنی تسکین پاتی ہوں!'' سائرہ نے سانس کے دوران میں کہا۔

''اور اسی لئے میں تمہارے قریب رہتا ہوں۔'' عرفانی نے اپنی دلکش مسکراہٹ کے ساتھ جواب دیا۔ دونوں کی نگاہیں ملیں اور جھک گئیں۔ عرفانی نے کمرے کا دروازہ بند کر لیا۔

چار دن کے بعد ـــــ

شام کا وقت تھا۔ شکیل، سائرہ کے کمرے میں آیا اور بولا:

''میں پرسوں 'مکھار' جا رہا ہوں، تمہیں میرے ساتھ چلنا ہے۔ ضروری سامان کا انتظام کر لو!''

''مکھار؟ جہاں ہیضہ پھیلا ہوا ہے؟''

''ہاں!''

سائرہ اس وقت عجیب کشمکش میں تھی۔ شکیل اس سے گفتگو کر رہا تھا لیکن اس دوران میں اس نے ایک بار بھی سائرہ سے آنکھ ملا کر بات نہیں کی۔ سائرہ اس کے اس طرز عمل سے دہل رہی تھی۔

''وہاں کیوں جا رہے ہو تم؟''

''کیوں کہ وہاں میری ضرورت ہے۔'' شکیل نے ایک کرسی پر بیٹھتے اور ایک رسالہ اٹھاتے ہوئے کہا۔ ''وہاں کے باشندے جاہل اور وحشی ہیں۔ وہاں طبی امداد کا کوئی خاص انتظام نہیں ہے۔ حکومت نے جو ایک طبی وفد بھیجا تھا اس کے تین ڈاکٹر اور آٹھ نرسیں مر چکی ہیں!''

سائرہ کو ایک خوفناک شبہ ہوا۔

''لیکن میں وہاں کیا کروں گی؟ مجھے لے جانے سے فائدہ؟''

''صرف یہ کہ جب میں دن بھر کا تھکا ماندہ کام سے واپس آؤں تو خود کو بے گھر نہ سمجھوں!'' شکیل نے رسالے سے نگاہ ہٹائے بغیر جواب دیا۔ سائرہ کو اس زبردستی پر سخت غصہ آیا۔ مگر وہ خودکشی کرنا چاہتا ہے تو دوسرے کو کیوں مجبور کیا جائے؟ وہ ابھی مرنا نہیں چاہتی تھی۔ ابھی اس کی عمر ہی کیا تھی؟ پھر موت بھی اور ہیضہ کی! وہ کانپ گئی۔

''میں نہیں جاؤں گی۔'' وہ بولی۔

''تم ضرور جاؤ گی، میں فیصلہ کر چکا ہوں!''

''لیکن میں تمہارا فیصلہ نہیں مانتی۔'' وہ غصہ اور خوف سے بے تاب ہو کر چلائی۔ ''میں نے تمہارے ساتھ شادی کی ہے، اس کے یہ معنی نہیں کہ میں تمہاری لونڈی ہوں۔ مجھے لاوارث نہ سمجھنا، ابھی میرے والدین زندہ ہیں۔ میں یہاں بھی بے بس نہیں ہوں، سمجھے؟''

''مجھے معلوم ہے!'' شکیل نے سرد مہری سے جواب دیا۔

''کیا معلوم ہے تمہیں، بولو! کیا معلوم ہے تمہیں؟''

''بکواس مت کرو۔'' شکیل کا لہجہ سخت ہو گیا۔ ''مجھے سب کچھ معلوم ہے، میں اس سے پہلے بھی بہت کچھ جانتا تھا۔ مجھے معلوم تھا کہ تم ایک ناکارہ لڑکی ہو لیکن میں نے تم سے محبت کی، مجھے معلوم تھا کہ تمہیں نہیں پوچھتا لیکن میں نے تم سے محبت کی۔ مجھے تم سے بہتر لڑکیاں مل سکتی تھیں لیکن میں نے تم سے محبت کی اور شادی کر لی، یہ میری غلطی تھی۔''

سائرہ نے آج تک شکیل کے منہ سے ایسے توہین آمیز الفاظ نہیں سنے تھے۔ اسے تعجب تھا کہ شکیل کا ایسا خاموش انسان اتنے الفاظ کہاں سے پا گیا۔ لیکن ساتھ ہی ساتھ خوف زدہ بھی تھی کیونکہ شکیل کی ضدی طبیعت سے واقف تھی۔ ڈرتے ڈرتے بولی:

''تم مجھے چھوڑ کیوں نہیں دیتے؟''

''اس لئے کہ میں تمہیں برباد کرنا نہیں چاہتا، مجھے تم سے محبت ہے!''

''لیکن میں چاہتی ہوں کہ تم مجھے چھوڑ دو، مجھے آزاد کر دو، مجھے طلا ـــــ''

آخری لفظ سائرہ کے گلے میں گھٹ کے رہ گیا۔

''صاف کیوں نہیں کہتیں کہ میں تمہیں طلاق دے دوں تا کہ تم اس آوارہ انسان کے پلے بڑھاؤ اور ہمیشہ کے لئے برباد ہو جاؤ!''

سائرہ سب کچھ سن سکتی تھی لیکن عرفانی کے لئے لفظ 'آوارہ' برداشت نہیں کر سکتی تھی۔ وہ کھڑی ہو گئی اور بھرائی ہوئی آواز میں بولی:

''تم ایک شریف انسان کو بدنام کر رہے ہو!''

''مجھے اس شریف انسان کی شرافت معلوم ہے، اسی شرافت کی ایک شکار تم بھی تو ہو!'' شکیل نے حسب معمول خشک لہجے میں کہا۔

سائرہ تلملا گئی۔ ''تمہیں معلوم کیا کہ محبت کسے کہتے ہیں۔'' وہ اس وقت آپے سے باہر ہو رہی تھی۔ ''اگر تم سننا چاہتے ہو تو سنو کہ مجھے عرفانی سے محبت ہے، بہت دنوں سے ہم

ایک دوسرے کو چاہتے ہیں اور اس لئے میں چاہتی ہوں کہ بغیر کسی قسم کی بدنامی کے تم مجھے چھوڑ دو، ورنہ ـــــ''

''ورنہ یہی کہ تمہیں میرے ساتھ چلنا پڑے گا۔'' شکیل نے طنزاً کہا۔

سائرہ پھٹ پڑی ـــــ ''تم مجھے چھوڑ دو، مجھے چھوڑ دو، میں تمہیں نہیں چاہتی، مجھے تم سے ـــــ''

''نفرت ہے؟ یہی کہنا چاہتی ہونا؟ مجھے معلوم تھا!''

شکیل کمرے میں ٹہلنے لگا۔ یکایک اس نے سائرہ کے چہرے پر نگاہیں گاڑتے ہوئے کہا:

''ادھر دیکھو! میں تمہیں چھوڑ سکتا ہوں، لیکن ایک شرط پر!''

سائرہ، شکیل سے نگاہیں نہ ملا سکی۔

''سنو، میں تمہیں اس شرط پر چھوڑ سکتا ہوں کہ فارانی تم سے نکاح کرے، ورنہ میرے ساتھ چلنے کے لئے تیار رہنا۔ سمجھیں؟''

''یہ کیا مشکل ہے، عرفانی تو یہی چاہتا ہے، وہ تمہارا بہت شکر گذار ہوگا۔''

شکیل بے اختیار ہنس دیا ـــــ ''اچھا!''

سائرہ نے ٹیلی فون اٹھایا اور عرفانی سے التجا کی کہ وہ فوراً اس سے ملے، تھوڑی دیر بعد دونوں ریاض کے ڈرائنگ روم میں بیٹھے ہوئے تھے۔

''شکیل مجھے مکھار لئے جا رہا تھا، میں نے انکار کر دیا، تو ہم دونوں میں سخت کلامی تک نوبت پہنچ گئی۔ آخر وہ مجھے ہمیشہ کے لئے چھوڑ دینے پر تیار ہو گیا ہے۔ لیکن ایک شرط پر۔'' سائرہ نے جلد، جلد سب باتیں عرفانی سے کہہ ڈالیں۔

''ایک شرط پر! خوب! کون سی شرط ہے وہ؟''

''تم وعدہ کرو کہ وہ شرط پوری کرو گے۔''

''تم کہو تو!''

''تم مجھ سے نکاح کر لو!''

عرفانی سناٹے میں آ گیا۔ اسے یہ امید نہ تھی کہ بات یہاں تک پہونچ جائے گی۔ وہ اس قسم کے کھیل کا عادی تھا۔ مگر کسی کھلونے کا پابند ہونا نہیں چاہتا تھا۔ گفتگو کا رخ پھیرتے ہوئے بولا:

''آخر وہ مکھار کیوں جا رہا ہے؟''

''وہاں ہیضہ پھیلا ہوا ہے۔ کہتا ہے میں غریبوں کی مدد کروں گا۔''

عرفانی نے عورت کی نفسیاتی کمزوری سے فائدہ اٹھانا چاہا۔

''یہ تو اس کی بڑی بلند ہمتی ہے۔'' مجھے اس سے اس بڑائی کی توقع نہ تھی۔ کم از کم ایسے موقعوں پر میں اتنی ہمت نہ کر سکتا۔ بلکہ میں تو یہ کہوں گا کہ اس حالت میں تمہارا اس کے ساتھ جانا مناسب ہے۔''

سائرہ کچھ نہ سمجھ سکی۔

''کیا کہہ رہے ہو تم؟ بس یہی موقعہ ہے کہ ہم دونوں آسانی سے ایک دوسرے کے ہو سکتے ہیں۔''

''بڑی مشکل ہے۔'' عرفانی نے اپنے چہرے پر پریشانیاں ظاہر کرتے ہوئے کہا۔ ''اگر اس نے اس طرح تمہیں طلاق دیدی اور پھر ہم دونوں کا نکاح ہو گیا تو اس میں میری بڑی بدنامی ہوگی۔ اور تم جانتی ہو کہ آج کل ہر افسر کو کتنا محتاط رہنا پڑتا ہے۔ نوکری تو بات بات پر جاتی ہے، اس حالت میں اگر میں تم سے ——''

سائرہ زیادہ نہ سن سکی، بے تابی سے پوچھ بیٹھی۔

''دیکھو! میں صاف بات جانتی ہوں۔ یہ گھما پھرا کے باتیں کرنا مجھے پسند نہیں، اپنے وعدوں کے مطابق تم مجھ سے نکاح کر لو اور بس۔''

''لیکن ذرا سوچ لو'' عرفانی نے سنجیدہ ہو کر کہا۔ ''اس حالت میں جبکہ میرے مقام وقیام ہی کا کچھ ٹھیک نہیں ہے، میں تم سے کیسے نکاح کرلوں؟ میں آج یہاں ہوں تو کل وہاں، جنگل جنگل گھومنا پڑتا ہے!

''تمہیں میری تکلیف کا تو اتنا خیال ہے اور میری بدنامی اور محبت کا کچھ خیال نہیں۔ تم تو کہتے تھے کہ تمہیں مجھ سے محبت ہے۔''

''میں کب کہتا ہوں کہ مجھے تم سے محبت نہیں۔ تم تو میری عزیز ترین شئے ہو۔ لیکن ہمیں عقل سے کام لینا چاہئے، تاکہ ہماری محبت کے کھیل بھی قائم رہیں اور ہماری بدنامی بھی نہ ہو۔ میں تو یہی مناسب سمجھتا ہوں کہ تم شکیل کے ہمراہ مکھار چلی جاؤ۔''

''دیکھو! تم مجھے صاف جواب دو۔'' سائرہ نے فیصلہ کن لہجہ میں پوچھا۔ ''تم مجھ سے نکاح کروگے یا نہیں؟''

عرفانی بھی اب اس گفتگو سے اکتا گیا تھا۔ ذرا تیز ہو کر بولا:

''فی الحال میں کوئی وعدہ نہیں کرسکتا۔''

سائرہ اس صاف جواب کے لئے تیار نہ تھی، بھوکی شیرنی کی طرح گرج اٹھی۔

''کیا کہا؟ وعدہ نہیں کرسکتے؟ لیکن ایک عورت کو برباد کرسکتے ہو، اس کی عصمت بگاڑ سکتے ہو، یہی تمہاری شرافت ہے، یہی تمہارا وعدہ ہے؟ تم مجھ سے کھیلنا چاہتے تھے، میری جوانی سے کھیلنا چاہتے تھے۔ کیوں؟ جھوٹے، دغاباز! تم نے پہلے ہی کیوں نہ کہہ دیا، بزدل کہیں کے!''

عرفانی کھسیانی ہنسی ہنسنے لگا۔

سائرہ کے تن بدن میں آگ لگ گئی، چلائی:

نکل جاؤ یہاں سے!

خدا تمہیں ناش کرے، بے حیا، کمینے انسان!

عرفانی چپکے سے اٹھا اور کمرے کے باہر نکل گیا ــــــ سائرہ کوچ پر سسکیاں لینے

لگی۔ وہ آج ایک شکستہ دل عورت تھی جس کا وقار خود اس کی نگاہوں میں ختم ہو چکا تھا۔ جب رات کو شکیل آیا تو سائرہ نے بغیر اس کی جانب دیکھے ہوئے کہا:

''میں تمہارے ساتھ چل رہی ہوں!''

''مجھے معلوم تھا۔ میں نے تمہارے اسباب کا بندوبست کرلیا ہے!''

ہر طرف موت تھی، بھیانک، یکساں اور یقینی!

لوگ کیڑے مکوڑوں کی طرح مر رہے تھے۔ کوئی کسی کا پرسان حال نہ تھا۔ مکھار کی آبادی سسک سسک کر دم توڑ رہی تھی۔ ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ مکھار اور شکیل صبح سے رات گئے تک دورے میں گذار دیتے۔ وبا اپنے شباب پر تھی۔ پھر بھی شکیل کی کوشش بے سود نہ گئی۔ رفتہ رفتہ ہر گھر میں ایک دو مریض بچنے لگے۔

مکھار ڈویژن میں جو ایک چھوٹا سا ہسپتال تھا وہ شکیل کے ماتحت دیدیا گیا تاکہ اسے اپنے مقصد میں خاطر خواہ کامیابی ہو سکے۔ اسپتال میں بیس نرسیں تھیں اور لیڈی ڈاکٹر بینا داس ان کی افسر تھی۔

شکیل کے ساتھ تو ہر دورے میں اکثر نرسیں بھی جاتی تھیں۔ انہوں نے اپنی آنکھوں سے شکیل کی سرگرمی دیکھی اور اس کی شرافت اور بلند ہمتی کے چرچے زبانوں پر آگئے۔ لوگ اسے ایک فرشتہ خیال کرتے تھے۔ سائرہ کے کان بھی اپنے شوہر کی تعریف سے نا آشنا نہ رہ سکے۔ اس نے شکیل کی شہرت سنی اور دل تھام کے رہ گئی۔ وہ اس سے قبل کچھ سمجھ سکتی۔

سائرہ، دل شکستہ اور فریب خوردہ سائرہ کے دل میں اچانک ایک خیال آیا۔ کیوں نہ وہ بھی نرسوں میں شامل ہو جائے؟ اس کی زندگی آخر کس کام کی۔ وہ اپنی زندگی سے اکتا چکی تھی، پشیمانی اور احساس گناہ نے اسے اپنی نگاہوں میں ذلیل کر رکھا تھا۔ کیا یہ ممکن نہ تھا کہ موت کے سمندر میں ڈوبنے والوں کو اپنی خدمت سے کسی قدر سہارا دیکر اپنی غلطیوں کی

کچھ تلافی کردے؟ شاید ـــــ اور وہ اسپتال کی طرف روانہ ہوگئی۔

''میں چاہتی ہوں کہ اپنی ماتحت نرسوں میں مجھے بھی شامل کر لیجئے!'' سائرہ نے بنیاداس سے کہا۔ ''میری تمنا ہے کہ کچھ کام کروں!'' بیناداس جانتی تھی کہ سائرہ شکیل کی بیوی ہے۔ وہ سخت کشمکش میں مبتلا ہوگئی۔ ایک افسر اعلیٰ کی بیوی اور اس کی ماتحتی میں کام کرے، اسکے لئے وہ تیار نہ تھی۔ اس نے شائستہ طریقے سے جواب دیا:

''مجھے افسوس ہے کہ آپ نے اتنی تکلیف کی۔ ساتھ ہی ساتھ مجھے خوشی بھی ہے کہ آپ نے اتنی ہمت کی، لیکن یہ ہمارے لئے انتہائی ندامت کا باعث ہوگا اگر میں آپ کو ایک معمولی نرس کا کام دوں۔ آپ کا نازک اور حسین جسم اس قابل نہیں کہ آپ اس خوفناک وبا میں میلوں کا سفر کرسکیں۔ آپ کے شوہر کے احسانات اور خدمتیں ـــــ''

''لیکن آپ مجھے شامل کر لیجئے۔ میری یہی خوشی ہے کہ اپنے شوہر کی پیروی کروں!'' سائرہ نے ضد کرتے ہوئے کہا۔

بیناداس مسکرادی۔ میں اس کی اجازت نہیں دوں گی۔ ڈاکٹر شکیل جب دن بھر کے تھکے ماندے گھر پہونچتے ہوں گے تو آپ کو قریب پاکر آرام پاتے ہوں گے۔ میں سمجھتی ہوں کہ یہی آپ کی سب سے بڑی خدمت ہے کہ ڈاکٹر شکیل کو تکلیف نہ ہو۔''

سائرہ دل مسوس کر رہ گئی۔

دوپہر کا وقت تھا۔ سائرہ کو اچانک یہ محسوس ہوا کہ اس کا سر چکرا رہا ہے اور طبیعت مالش کر رہی ہے۔ وہ اٹھ کر ٹہلنے لگی۔ یکایک وہ بیٹھ گئی اور قے کردی۔ ہیضہ! برقی سرعت کے ساتھ اسے خیال آیا اور وہ بے ہوش ہوگئی۔

آنکھ کھلی تو بیناداس اس کے سرہانے بیٹھی مسکرا رہی تھی۔

''میں کتنی دیر زندہ رہ سکتی ہوں؟'' سائرہ نے مایوسانہ لہجہ میں کہا۔ ''کیا میرے شوہر کو خبر ہوگئی؟''

''گھبرایئے نہیں۔'' بینا داس مسکراتے ہوئے بولی۔ ''انہیں پریشان کرنے کی ضرورت نہیں۔ آپ جس دھوکے میں ہیں، وہ نہیں ہے، مجھے اسی دن شک ہوا تھا جس دن آپ اسپتال میں تشریف لائی تھیں۔ یہ ہیضہ نہیں ہے بلکہ...... '' اور اس نے جھک کر کان میں کچھ کہہ دیا۔

سائرہ کا زرد چہرہ یک بیک سرخ ہو گیا۔

رات کے نو بجے شکیل تھکن سے چور واپس آیا۔ اس کا چہرہ موت کی مانند زرد تھا اور پیشانی پر پسینے کے قطرے چمک رہے تھے۔ سائرہ کے دل میں پہلی بار ہمدردی کا جذبہ نمودار ہوا۔ اسے افسوس تھا کہ وہ اس کی خدمت نہ کر سکی۔ کم از کم شکیل کو اتنا رنجیدہ نہ ہونا چاہئے تھا۔ وہ مرد تھا اور ایک عورت کی بے عنوانی کا اتنا گہرا اثر لینا اس کے لئے جائز نہ تھا۔ لیکن وہ ایک حساس طبیعت لے کر آیا تھا اور سائرہ جانتی تھی کہ اسے اب تسلی نہ دے سکے گی۔

شکیل بہت دیر تک سائرہ کے قریب بیٹھا رہا۔ دونوں خاموش تھے۔ شاید گفتگو کا موضوع تلاش کر رہے تھے۔ آخر سائرہ بولی:

''تم اتنی محنت کیوں کرتے ہو؟''

''تا کہ خوشیوں کا خیال نہ آئے!'' شکیل نے جواب دیا۔

''مجھے افسوس ہے کہ میں نے تمہیں تکلیف پہونچائی۔ میں تمہارے لائق نہ تھی۔''

شکیل نے ایک گہری سانس لی ——

''بدقسمتی!'' اس نے کہا —— ''آج بینا داس کیوں آئی تھیں؟''

''میری طبیعت اچانک خراب ہو گئی تھی۔ مجھے ہیضہ کا ڈر تھا۔ لیکن انہوں نے کہا کہ یہ ہیضہ نہیں ہے، سائرہ اور کچھ نہ کہہ سکی۔

''کیا کہا انہوں نے؟''

سائرہ کا چہرہ ایک بار پھر گلنار ہو گیا۔ نگاہیں نیچی کرتے ہوئے بولی۔

''انہوں نے کہا کہ ـــــ میں ـــــ ماں بننے والی ـــــ ہوں!''

''ہوں!'' شکیل نے کہا اور کھڑا ہو گیا۔ جیب سے سگریٹ کیس نکالا، ایک سگریٹ سلگائی، پھر چھت پر نگاہیں گاڑتے ہوئے بولا:

''باپ کون ہے!''

سائرہ اس وقت ایک جھوٹ بول کر اپنی آئندہ خوشیوں کو استوار کر سکتی تھی۔ لیکن وہ جواب نہ دے سکی۔ اسے محسوس ہوا کوئی اسکا گلا گھونٹ رہا ہے۔ اس کے دل کی حرکت بند ہو رہی ہے۔ اس کا دل اپنی بے بسی پر بھر آیا۔ اس نے کروٹ لی اور منہ تکیوں میں چھپا لیا۔ وہ رو رہی تھی!

''مبارک ہو!'' شکیل نے کہا۔

سائرہ پلنگ پر لیٹے لیٹے گذشتہ دنوں کو یاد کر رہی تھی۔ کتنی جلد سب کچھ ہو گیا! سب کچھ بنا اور بگڑ گیا، وہ شکیل کو نہ پہچان سکی۔ وہ عرفانی کو بھی نہ پہچان سکی۔ اس نے دونوں سے دھوکا کھایا! کتنی رنگین اور حسین تھیں وہ ساعتیں جب وہ عرفانی کے بازوؤں میں تھی، لیکن کتنی کریہہ، کتنی بھیانک تھی ان ساعتوں کی یاد!

آنے والے ایام اب اس کے لئے کیا لائیں گے؟ شوہر کی محبت کی تمنا ایک خواب سے زیادہ مبہم، زیادہ ناپائیدار تھی، پھر وہ کس کے سہارے جئے گی؟ اور اب جبکہ وہ ماں بننے والی تھی۔ اسے اپنے بچے کا خیال آیا۔ کیا شکیل کا دل اس کے بچے کی طرف مائل ہوگا؟ کیا اس کا بچہ شفقت پدری سے محروم رہے گا؟ وہ معصوم، اس نے کیا گناہ کیا تھا؟ وہ زیادہ نہ سوچ سکی۔ اسکی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔

دروازہ کھلا اور اسپتال کا ایک چپراسی اندر آیا ـــــ ''آپ کو میم صاحب نے بلایا ہے حضور، دیر نہ کیجئے۔'' چپراسی نے کہا۔

''کیا بات ہے؟ سائرہ کا دل دھڑ کنے لگا۔

''معلوم نہیں حضور، بلایا ہے آپ کو!''

سائرہ فوراً تیار ہوگئی۔ اسے دو خیال آئے ــــ شاید بینا داس اسے نرسوں میں شامل کرلے؟ شاید اس کی موجودہ حالت کے لئے کوئی خاص صلاح دینے کی ضرورت ہو؟ لیکن کسی خیال نے اس کی تسلی نہ کی۔ کسی آنے والے خطرے کے احساس نے اسے بے چین کر دیا تھا ــــ کیا ہونے والا ہے؟

بینا داس اسپتال کے دروازے پر کھڑی تھی۔ باوجود ضبط کے اس کے چہرے سے بے چینی نمایاں تھی۔

''گھبرایئے نہیں۔'' بینا داس نے استقبال کرتے ہوئے کہا ــــ ''ڈاکٹر شکیل کی طبیعت کچھ ناساز ہے!''

سائرہ نے کچھ پوچھنا چاہا لیکن بینا داس آگے بڑھ گئی۔

''تشریف لایئے!'' اس نے کہا۔ ڈاکٹر شکیل دورے سے سیدھے یہاں آئے۔ پھر ان کی طبیعت خراب ہوگئی۔ اندر چلئے۔''

سائرہ نے ڈرتے ڈرتے کمرے میں قدم رکھا۔ کمرہ تاریک تھا اور پلنگ پر شکیل لیٹا ہوا تھا۔ سائرہ قریب پہونچی لیکن ٹھٹھک کے رہ گئی۔ شکیل کو پہچاننا مشکل تھا! آنکھوں میں گہرے سیاہی مائل حلقے پڑ گئے تھے، رخساروں پر سیاہی دوڑ گئی تھی، نظریں کمزور تھیں اور سانس اس طرح چل رہی تھی گویا چلتے چلتے تھک چکی ہو! یہ ہیضہ کا حملہ تھا!

سائرہ گھبرا گئی۔ اسے یقین ہو گیا کہ شکیل کچھ دیر کا مہمان ہے۔ وہ اس کے لئے کیا کرسکتی تھی؟ کچھ نہیں! لیکن اسے معافی مانگنا چاہئے۔ یہ وہی تھی جس نے شکیل کو زندگی اور اس کی خوشیوں سے محروم کر دیا تھا۔ لیکن وہ ابھی زندہ تھا، کیا اب کچھ نہیں ہوسکتا تھا؟

وہ پلنگ پر جھک گئی۔ ''تمہاری طبیعت کیسی ہے؟ میں ہوں سائرہ! بولو، جواب دو، میں معافی مانگنے آئی ہوں، مجھے معاف کردو، مجھے معاف کردو!'' اور آنسوؤں کے دو گرم

قطرے سائرہ کے رخساروں پر بہتے ہوئے آئے اور شکیل کی پیشانی پر ٹپک پڑے۔
شکیل کی آنکھیں کھلیں، نحیف اور بے آواز آنکھیں اور سائرہ پر جم گئیں:
''کیا ــــــ؟'' اس کی آواز بمشکل سنائی دی۔
سائرہ اس پر بالکل جھک گئی۔ ''مجھے معاف کردو، مجھے معاف کردو!''
شکیل کے کمزور ہاتھ کانپتے ہوئے اٹھے اور سائرہ کے بالوں میں الجھ گئے۔
''مجھے ــــــ تم سے ــــــ محبت ہے!'' اس نے لڑکھڑائی ہوئی آواز میں کہا، پھر گویا اسے سکون ہوگیا ــــــ اس نے آنکھیں بند کرلیں، زندگی کا چراغ گل ہوگیا، ہمیشہ کے لئے!

یہ سائرہ کے پہلے خواب کی تعبیر تھی!!

اور اسے اپنے دوسرے خواب کا خیال آیا ــــــ عرفانی! ــــــ اس نے سوچا اور اس کے چہرے پر نفرتیں امنڈ آئیں ــــــ

☆☆☆

مطبوعہ: سالنامۂ عالمگیر، لاہور: 1941ء

AFSANAY

Salik Lucknavi

Edited by

Dr.Omar Ghazali